
یہ بُلبلیں یہ تِتلیاں
www.FreePdfBooks.org
www.FreePdfBooks.org

فہرست

☆......☆......☆

قصہ ایک محبت کا

معصومہ کو جب میں پہچاننے لگا تو میرے دل میں اسے جاننے کی خواہش ابھرنے لگی اور مرد کے دل میں جب کسی عورت کی کھوج ابھرے تو وہ اسے بنا وقت ضائع کئے محبت کا نام دے ڈالتا ہے' حالانکہ محبت تو اس دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ اگر محبت کرنا اتنا ہی آسان ہوتا تو کیا خدا جنت جیسی قیمتی شئے کے بدلے بندوں سے ان کی سچی محبت طلب کرتا؟

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے جب معصومہ کی کھوج لگی تو میں اسے محبت سمجھنے لگا۔ وہ کہاں رہتی ہے' کیا کرتی ہے' کیسے بولتی ہے اور کیا سوچتی ہے؟ مجھے ان سب باتوں کی کھوج رہنے لگی۔ میں اس کا منتظر رہنے لگا اور ایک وقت مقررہ پر اس کو دیکھنے کا عادی ہو گیا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ان باتوں سے مرد محض یہی نتیجہ اخذ کر پاتا ہے کہ اسے اس عورت سے محبت ہو گئی ہے۔ لہٰذا میں نے خود کو چاندنی راتوں میں اپنے گھر کے سونے صحن میں بیٹھ کر بارہا یہ باور کرایا کہ میں معصومہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ یہ تو محض سفر کا آغاز تھا اور محبت کی پرکھ تو سفر کے اختتام سے وابستہ ہے۔

میں ان دنوں نیا نیا روزگار سے لگا تھا اور اپنی تنخواہ بڑھوانے کے چکر میں مزید ڈگریوں کا حصول چاہتا تھا۔ اگلے امتحان میں شرکت کا پرائیویٹ فارم بھر کر میں پڑھائی کی غرض سے روزانہ اپنے آفس سے واپسی پر قریبی لائبریری میں جا بیٹھتا تھا۔ معصومہ بھی وہیں آیا کرتی تھی۔ میں نے اسے کبھی بھی آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ وہاں پہلے سے موجود ہوا کرتی تھی۔ اس کی ایک مخصوص میز تھی جہاں وہ مجھے روزانہ بیٹھی ہوئی ملتی تھی۔ اس

کے پاس کئی رنگوں کی قمیصیں تھیں' مگر دوپٹہ اور شلوار صرف سفید رنگ کے تھے۔ پیروں میں وہ ہمیشہ براؤن رنگ کے سینڈل پہنا کرتی تھی۔ اس کے حلیے سے یہ اندازہ لگانا مشکل امر نہ تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔ یہ اندازہ بھی لگانا آسان تھا کہ وہ ایک شرمیلی اور لیے دیئے رہنے والی لڑکی تھی۔ میں نے کبھی اسے کسی سے فالتو' فضول بات کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس کا نام بھی میں نے ایک لڑکی کے منہ سے سنا تھا جو ایک مرتبہ اسے لینے کے لئے آئی تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میری اس کی جانب توجہ اس کے نام ہی نے مبذول کرائی تھی۔

''معصومہ!'' میں زیر لب دہرانے پر مجبور ہوا تھا۔ اور پھر اگلے روز اسے اسی مخصوص میز پر بیٹھا دیکھ کر' میرے لبوں سے خود بخود نکلا ''معصومہ!''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ مجھے بہت معصوم اور اپنی اپنی سی لگی اور پھر اس کے بعد خیالات کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ خیالات کے اس سلسلے میں وہ میری ہم قدم رہی اور کچھ عرصے کے بعد ایک چاندنی مگر اداسی سے بھری رات میں' میں نے اپنے گھر کے سونے صحن میں بیٹھ کر خود کو یہ باور کرایا میں معصومہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔

نجانے یہ محبت تھی یا میں نے اس جستجو کا نام محبت رکھ دیا تھا جو میرے دل میں اس کو دیکھ کر جاگی تھی۔ جستجو' محبت نہیں ہوتی' جستجو تو جان لینے کے بعد ختم ہو جایا کرتی ہے اور محبت جان لینے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

میں نے معصومہ کو جان لینے کی کوشش شروع کر دی۔ میں آفس سے جلد از جلد اٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور بلاناغہ لائبریری جایا کرتا تھا۔ میں کوشش کرتا کہ میری نشست اس کی نشست سے قریب تر ہو۔ کورس کی کتابوں کے بجائے اب میں اس کے چہرے کو پڑھنے لگا۔ میری نوٹ بک خالی رہتی اور میرے دل کے صفحات رنگین ہوتے چلے جاتے۔ ان پلکوں کا گرنا' اٹھنا' ان لبوں کا پھیلنا' سمٹنا۔ اس کے نقوش کی بولی مجھے ازبر ہو گئی۔ میں اس کے انداز کے ہر رنگ کو پہچاننے لگا' لیکن شاید یہ محض جستجو کا سفر ہی تھا' محبت نہ تھی۔

مرد آغاز میں ہی جستجو کو محبت تسلیم کر لیتا ہے اور عورت اس کی اس غلطی کو آخر تک بڑی وضع داری سے نبھاتی ہے۔

میرے دل میں معصومہ کو اپنانے کی خواہش جاگنے لگی۔ ہر مرد اپنی محبت کو پہلی فرصت میں اپنانا چاہتا ہے اور بسا اوقات اپنی مصروفیت کو بھی فرصت میں تبدیل کر لیتا ہے۔ جو وقت مجھے اپنے امتحان کی تیاری کے لئے درکار تھا' اسے میں نے معصومہ سے محبت کرنے میں صرف کرنا شروع کر دیا اور مرد کی دلچسپی میں اتنی تپش تو ضرور ہوتی ہے کہ اسے اپنے گالوں پر محسوس کر کے کوئی بھی لڑکی ہڑ بڑا کر ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ در دل پر یہ دستک کون دیتا ہے؟

معصومہ کو بھی میری لگن کا احساس ہو گیا۔ اب وہ قدرے الجھن کا شکار نظر آنے لگی۔ اس کے ہر انداز میں ایک کھنچاؤ سا آ گیا۔ بے فکری سے مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنے کی وہ عادت رخصت ہو گئی۔ اب وہ بار بار چونک کر' میری جانب دیکھا کرتی تھی اور مجھے دیکھتا پا کر جلدی سے اپنی کتاب پر جھک جایا کرتی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں چمکتے اس کی کتابی چہرے کی ہر ہر سطر پر بے چینی اور تذبذب کی تحریر واضح طور پر پڑھی جانے لگی۔

تب ایک روز میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے معصومہ سے سب کچھ کہہ ڈالنا چاہئے۔ یہ کہ میں اسے چاہتا ہوں۔

''معصومہ! میں تمہیں چاہتا ہوں۔'' ایک روز ریہرسل کے طور پر میں نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر دہرایا۔

پھر میں خود ہی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے جواب میں وہ کیا کہے گی؟ اسے کیا کہنا چاہئے؟ اس جملے کا مفہوم کیا ہے؟

''میں تمہیں چاہتا ہوں۔''

یہ کہ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں؟ تمہارے وجود پر قابض ہونا چاہتا ہوں؟ تمہاری سوچوں پر اپنا تسلط چاہتا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

اور اگر اس نے پوچھ لیا کہ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ مجھے چاہتے ہیں تو چاہتے رہیں۔ اس سلسلے میں بھلا میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس سوال کا جواب بے حد آسان تھا۔ ایک سادہ سی حقیقت' ''میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں معصومہ! تمہارے وجود سے اپنے وجود کی تکمیل چاہتا

ہوں۔ تمہاری خوشبو سے اپنی تنہائیوں کو سجانا چاہتا ہوں۔ اپنے گھر کے سونے پن کو تمہاری پازیب کی آواز سے بھر لینا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا ساتھ بخش دو معصومہ! مجھے شدت سے تمہاری ضرورت ہے۔"

اور اگر اس نے مجھ سے ضرورت اور محبت کے بیچ فرق جاننا چاہا پھر؟

میں سوچ میں پڑ گیا۔

ہاں مگر کوئی تمنا پسِ دامانِ وفا
مجھ سے پوشیدہ مرے پیشِ نظر ہوتی ہے

"مرد کی محبت' ضرورت ہی تو ہوتی ہے معصومہ!"

میری آواز کسی گہرائی سے آئی۔ "آدم کو ازل سے حوا کی ضرورت ہے۔"

"ضرورت تو پوری ہو کر' ختم ہو جاتی ہے۔" ایک استہزائیہ ہنسی میری کانوں میں گونجی۔ "ضرورت ہی تو تھی۔"

میرے ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔

ہاں' اگر ایسا ہوا کہ اس نے میرا سوال یونہی ہنسی میں اڑا کر رد کر دیا' پھر؟

"پھر دستِ سوال اس کے سامنے دراز ہی مت کرو۔" میرے آفس کے ایک کولیگ نے حالِ دل سن کر مجھے مشورہ دیا۔ "سیدھے سیدھے اس کے گھر رشتہ بھیج دو۔ لڑکیاں یوں بھی ایسے معاملات اپنے والدین کے حوالے کر دیا کرتی ہیں۔"

میں پھر پریشان پریشان سا اپنے گھر کے صحن میں آ بیٹھا۔ ایسے کام تو ماں اور بہنیں کیا کرتی ہیں۔ میری نہ تو ماں ہے نہ کوئی ماں جائی۔ پچھلے سال ابا کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا ہی رہ گیا تھا۔ اماں تو بہت پہلے میرے بچپن میں ہی مجھے تنہا چھوڑ گئی تھیں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے شدت سے ماں کی کمی محسوس ہوئی۔ ماں کی ہستی' جس کی مہربان گود میں اپنا چہرہ چھپا کر انسان زندگی کا ہر دکھ کہہ سکتا ہے۔ جس کے کمزور وجود کے پیچھے چھپ کر ہر طوفان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ماں! جو کمزوری عورت کا سب سے طاقتور روپ ہے۔

اگر آج میری ماں زندگی ہوتی تو میں اس سے حالِ دل کہہ کر کتنا ہلکا پھلکا ہو

جاتا۔ وہ سب کچھ سنبھال لیتی۔ کچھ بھی کرتی' مگر معصومہ کو میرا بنا کر اپنے گھر لے آتی۔ میرا کام محض معصومہ کا گھونگھٹ اٹھا کر اظہارِ محبت کرنا رہ جاتا۔

ہائے! پھر وہی محبت اور پھر وہی اظہارِ محبت' اس دنیا کا سب سے مشکل کام! اپنے رد یا قبول کئے جانے کے منظر کو چشمِ تصور سے ملاحظہ کرنے کا کام میں نجانے کتنے دن تک کرتا رہا اور معصومہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا تاآنکہ میرے کولیگ نے پھر مجھ سے معصومہ کی بابت استفسار کیا۔

"تم تو بہت بزدل ہو بشر!" وہ بولا تھا۔ ایک لڑکی سے اظہارِ محبت کرنا بھلا ایسا بھی کیا مشکل کام ہے؟"

"مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"یوں کرو" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "اس کے لئے کوئی تحفہ خرید ڈالو...... جو عورت کے اٹریکشن رکھتی ہو۔ اسے وہ تحفہ دو۔ وہ یقیناً وجہ جاننا چاہے گی۔ بس پھر کیا بات ہے' بات سے بات نکلتی چلی جائے گی۔ اسے تمہارے جذبات کی شدت کا اندازہ ہو گا' تو یقیناً اس کے دل میں بھی تمہارے لئے نرم گوشہ پیدا ہو جائے گا۔ عورت کے دل میں اگر ایک بار کسی مرد کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو جائے تو پھر اسے حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔"

میں نے باسط علی کا شکریہ ادا کیا اور لائبریری چلا آیا۔

اب میرا زیادہ تر وقت یہ سوچنے میں صرف ہونے لگا کہ معصومہ کو کیا چیز تحفتہً دی جانی چاہئے' یہ میری جانب سے اس کے لئے محبت کا پہلا تحفہ ہوتا۔ ایک یادگار۔ اسے یقیناً خاص ہونا چاہئے تھا کہ کیا؟ میری الجھن بڑھنے لگی۔

ایک روز جبکہ میں پریشانی کے عالم میں اسے تکے جا رہا تھا اس نے جھنجھلا کر اپنی کتاب بند کی اور غصیلی نگاہ مجھ پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

لمحہ بھر کے لئے میرے دل کی دھڑکن تھم گئی۔ وہ نجانے کیا کرنے جا رہی تھی؟ کیا وہ مجھ سے باز پرس کرنے کا ارادہ رکھتی تھی؟ یا پھر لائبریری کے منتظمین کو میرے رویے کے متعلق آگاہ کرنے جا رہی تھی؟ وہ چند لمحے غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی' پھر اپنی کتابیں سمیٹ کر مرکزی دروازے کی طرف چل دی۔

میرا دل تاسف سے بھر گیا۔ مجھے یقیناً ایسا نہیں کرنا چاہیے میرا رویہ انتہائی فضول اور احمقانہ تھا۔ کسی بھی سیدھی سادی اور شریف لڑکی کو پریشان کرنے کا یہ آسان ترین اور گھٹیا ترین طریقہ تھا۔

میرے تصور کے پردے پر اس کے دو ہاتھ چمکنے لگے۔ کتابیں سمیٹتے ہوئے ہاتھ۔ اس کے ہاتھ بلاشبہ خوبصورت تھے۔ سفید' سفید صاف ستھرے' بھری بھری کلائیوں والے ہاتھ۔

ان ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں سجانے کا ارمان ایک بار پھر پوری شدت سے میرے دل میں جاگا۔ میں لائبریری سے نکل کر بازار چلا گیا۔ مختلف دکانوں کی خاک چھانتا' چیزیں دیکھتا' پسند کرتا اور رد کرتا ہوا میں آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا۔ جب ایک دکان کے شو کیس کے باہر ہی رک گیا۔ یہ ایک صراف کی دکان تھی اور میری توجہ شو کیس میں سجے ایک جڑاؤ کنگن نے کھینچ لی تھی۔ وہ بہت خوبصورت کنگن تھا۔ میرے تصور کے پردے پر بھری بھری کلائیاں لہرائیں اور اس کنگن کو معصومہ کی کلائی میں سجا دینے کی خواہش سے میرا پورا وجود بھر گیا۔

میں دکان کے اندر گھس گیا اور اس کے مالک سے کنگن کی بابت استفسار کیا۔

''بائیس ہزار'' اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے اس کی قیمت بتائی تھی۔ میں سر جھکا کر دکان سے نکل آیا۔

فٹ پاتھ پر چل کر اپنی بائیک کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں اس قابل ہوں کہ معصومہ کو بائیس ہزار کی چیز تحفتہً دے سکوں؟ لیکن دل تھا کہ کسی بچے کی طرح مچل مچل کر اسی چاند کی ضد کئے جا رہا تھا۔ یہ ایک مرد کا دل تھا اور مرد شیر مار سکتا ہے۔ لیکن اپنے دل کو نہیں مار سکتا یہ کام تو ازل سے کمزور عورت کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔

میں نے ایک نگاہ اپنی بائیک پر ڈالی۔ پچھلی مہینے حامد مستری میرے محلے میں رہتا تھا۔ پرانی گاڑیوں کی مرمت اور خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ نجانے کیوں وہ پچھلے دو سالوں سے میری موٹر سائیکل کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

''باؤ جی۔ حس دسووی'' کی خیال اے؟'' مجھے گلی میں آتے جاتے اکثر پشت پر اس کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ مجھے اپنی موٹر سائیکل بیچ کر نئی موٹر سائیکل خرید لینی چاہیے' جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مجھے اپنی چاند گاڑی بے حد عزیز تھی۔

حامد مستری کی ترغیب میں جیسے جیسے شدت پیدا ہوئی تھی' ویسے ویسے میرے اندر ارادے کی پختگی میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔

میں گھر جانے کے بجائے سیدھا حامد مستری کی دکان پر جا پہنچا۔

''مستری! موٹر سائیکل کا کیا دو گے؟''

''بیس ہزار!'' اس نے میرے چہرے پر لکھی ضرورت پڑھی اور فوراً کاری وار کیا۔

میں واپس مڑنے لگا تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔

ٹھہرو تو باؤ جی' اکھو تو' تسی وی بس......''

پھر وہ اندر گیا اور گن کر رقم لے آیا۔

''پورے پچیس ہزار ہیں۔ ویسے کیہہ کرنا اے تسی؟'' اس کے چہرے پر چمک اور لہجے میں شگفتگی تھی' میں جواب دیئے بنا باہر نکل آیا۔ حامد مستری کی دکان سے نکل کر' ایک لمحے کے لئے میں نے خود کو بے حد ادھورا محسوس کیا تھا۔ جیسے اچانک کوئی حادثہ پیش آیا ہو اور کوئی بہت قیمتی شئے انسان کی دسترس سے دور ہو جائے۔ لیکن پھر معصومہ کے طاقت ور خیال نے ہر خیال کو پس پشت دھکیل دیا۔

میں ٹیکسی کر کے جیولر کی دکان پر گیا اور کنگن خرید کر خوش خوش گھر چلا آیا۔

پوری رات میں نے کنگن سامنے رکھ کر طرح طرح کے لفظ تراشے۔ انہیں جوڑ جوڑ کر جملے ترتیب دیئے اور جوابات کے خوش رنگ خیال بنتا گیا۔

اس کنگن سے بات کر کے معصومہ کا حصول آسان نظر آتا تھا۔

دوسرے روز میں آفس سے ذرا پہلے اٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لائبریری نہ پہنچی ہو گی لیکن وہ مجھے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی نظر آئی۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالی پھر واپس اپنی کتاب کی جانب متوجہ ہو گئی۔ میں اس کی ہی ٹیبل پر' درمیان میں دو کرسیوں کا فاصلہ چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو ترتیب دیا' پھر اسے نظر بھر کر

دیکھا وہ اپنی کتاب کی جانب متوجہ نظر آ رہی تھی' لیکن یقیناً میری موجودگی کو بھرپور طریقے سے محسوس کر رہی تھی۔

میں نے ڈبیا نکال کر میز پر رکھی اور کچھ سوچنے لگا۔ میں بھلا کس طرح اسے متوجہ کرتا؟ مجھے کیا کہنا چاہئے تھا' میں اسے لائبریری سے باہر نکلنے کا کہنا چاہتا تھا' لیکن الفاظ کا چناؤ مجھے مشکل محسوس ہونے لگا۔

میں نے ایک عجیب سی حرکت کی۔ میں نے کنگن کو ڈبیہ سے نکالا۔ میز پر کھڑا کیا آہستہ سے لڑھکا دیا۔ وہ بھی ایسے معاملات میں بڑا پکا نظر آتا تھا۔ مستانہ وار عین اس کی نگاہوں کے سامنے جا کر گر گیا۔

معصومہ نے از حد حیرانی سے پہلے کنگن کو پھر مجھے دیکھا تھا۔ میں نے ڈبیہ بھی میز پر چھوڑی اور اٹھ کر لائبریری سے باہر چلا آیا۔ باہر آ کر میں لان میں جا کھڑا ہوا۔

وہ بھی میرے پیچھے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کنگن تھا۔

''سنیے!'' میں جھینپا جھینپا سا تھا۔

''جی نہیں۔ میں نے محض اسے خریدا ہے۔ یہ آپ کے لئے بنا ہے۔'' مجھے اس کے لہجے کی نرمی سے حوصلہ ہوا۔

''میں بھی نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں اول روز الجھن اور حیرت تھی۔

''یہ میری جانب سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہے معصومہ!''

''لیکن کیوں؟''

''اس لئے کہ میں...... میں...... میں۔''

وہ واحد لمحہ جہاں مرد کی زبان عورت کے سامنے لڑکھڑا جاتی ہے' میرے مقابل کھڑا تھا۔

''جی کہیے!'' وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ ......اور اگر اس لمحے میں عورت خود ہی ہتھیار ڈال کر کھڑی ہو جائے تو پھر فتح یاب ہونے میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے۔

معصومہ نے میرا کنگن قبول کر لیا' لیکن اس شرط کے ساتھ مجھے واپس لوٹا دیا کہ وہ کنگن میں اسے شادی کے موقع پر پیش کروں۔

میں اس کو جیت چکا تھا' پھر بھلا شادی میں کیسے تاخیر ہوتی۔ جلد ہی وہ میری دلہن بن کر میرے گھر کے اسی چھوٹے سے صحن میں اتر آئی جہاں بیٹھ کر میں اس کے تصور سے گھنٹوں گفتگو کیا کرتا تھا۔

شادی کے لئے میں نے اپنے آفس سے لون لے لیا تھا۔

ہماری زندگی خوشگوار انداز میں آگے بڑھنے لگی۔ بیٹی کی پیدائش کا موقع آیا تو میں نے آفس سے مزید لون لیا۔ میری تنخواہ تقریباً آدھی لون میں کٹنے لگی۔

معصومہ کو گھر کے کاموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ میں آفس میں اوور ٹائم لگاتا تھا۔ اب مجھے لون اتارنے کی ٹینشن رہتی تھی۔ گھر لوٹنے کی جلدی نہ ہوا کرتی تھی۔ گھر آ کر بھی میں جلد سے جلد سو جانے کی فکر میں رہتا تھا۔

معصومہ کی گفتگو میں اب وہ پہلے کی سی چاشنی نہ تھی۔ اسے گھر کے مسائل ازبر رہتے تھے وہ محبوبہ سے خاتون خانہ اور بیوی سے ماں بن گئی تھی۔ میرا ذہن مختلف خانوں میں بٹا رہتا تھا۔

سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ کنوینس کا تھا۔ میں سرتوڑ کوششوں کے باوجود اب تک دوبارہ موٹر سائیکل نہ خرید سکا تھا۔ بسوں اور ویگنوں میں دھکے کھا کھا کر سال بھر میں میرا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ رشتے داریاں نباہنی پڑتیں تو رکشوں اور ٹیکسیوں کا کرایہ مار ڈالتا۔ معصومہ کو میری مشکل کا احساس تھا۔ وہ بے چاری میری مشکل آسان کرنے کے لئے کمیٹیاں ڈالتی لیکن وہ گھر کے کسی دوسرے مسئلے کا حل بنا جایا کرتی تھیں۔

ایک روز میں آفس جانے کے لئے جھپک تیار ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ گھڑی کی سوئیوں کو کوس رہا تھا۔ جو ہما کسی کی مشکل کا احساس کئے برق رفتاری سے آگے بڑھتی ہی رہتی ہیں۔

اچانک ہی معصومہ میری قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''سنیے!'' اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔

''کہو!'' مجھے عجلت تھی۔

''آج آپ آفس مت جائیں۔''

''کیوں؟'' میں برہم ہو گیا۔ ''دماغ ٹھیک ہے؟''

''آج آپ جا کر اپنے لئے موٹر سائیکل خرید لیں۔'' اس نے ایک لفافہ میری جانب بڑھایا۔

''اس میں تیس ہزار روپے ہیں۔''

میرے ہاتھ یک لخت ٹھہر گئے۔ عجلت کے تمام انداز رخصت ہوئے۔

''تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی معصومہ؟'' میں حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیات میں گھرا ہوا تھا۔

''اگر میں سچ کہوں تو آپ خفا تو نہ ہوں گے......'' وہ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

''کہو تو!''

''میں...... اپنا کچھ زیور فروخت کر آئی ہوں۔ بشرا مجھ سے آپ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ میں نے اماں کی طرف والی چھپن اور وہ...... کنگن...... جو آپ نے شادی سے قبل خریدا تھا۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس بحر ندامت میں میرا دل بھی لمحہ بھر کو ڈوبا پھر میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔

''تم کتنی اچھی ہو معصومہ! تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔ مجھے احساس ہو رہا ہے میرا انتخاب کس قدر درست تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں' بہت جلد تمہیں دوسرا کنگن بنوا دوں گا۔''

''مجھے زیور نہیں...... ذہنی سکون چاہئے اپنا اور آپ کا!''

میں نے اس کا گال تھپتھپایا اور لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ میری نگاہ اس کی خالی کلائی پر پڑی تو میں سر جھکا کر گھر سے نکل گیا۔

میرے دل میں فی الوقت ایک موٹر سائیکل کی شدید خواہش تھی اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں دل مارنا خدا نے صرف عورت کو سکھایا ہے۔

معصومہ نے میری جستجو بھی پوری کر دی تھی اور ضرورت بھی۔ مرد آغاز میں ہی جستجو کو محبت تسلیم کر لیتا ہے اور عورت اس کی اس غلطی کو اخیر تک بڑی وضع داری سے نبھاتی ہے۔

یہی میری اور معصومہ کی کہانی ہے!

خواہشوں کی تتلیاں

رات کا پچھلا پہر تھا' باغیچے کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں چاند بالکل درمیان میں آرکا تھا۔ یوں جیسے وہ ہاتھ بڑھاتی تو اس کی ہتھیلی پر آ ٹکتا۔ اسے چاند تاروں کی خواہش نہ تھی۔ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل تھا۔ زیور' کپڑوں سے جی یوں بھرا تھا کہ الماریاں نت نئی چیزوں سے بھری پڑی تھیں۔ اور وہ بیواؤں کا روپ دھارے پھرا کرتی۔ دیوانوں کی سی باتیں کیا کرتی۔ گھومنے پھرنے کے سارے شوق کب کے ہوا ہو چکے تھے۔ بھری خوبصورت دنیا اس کے لئے جیسے راستے میں پڑنے والا بازار بن گئی تھی۔ ایسا بازار جس کی دکانیں اور ان میں سجی اشیاء آنکھ کی پتلی کا نقش بن چکی ہوں۔ جن کی جانب دیکھنے کو اب من نہ کرتا ہو' جہاں سے کچھ خریدنے کی حاجت محسوس نہ ہوتی ہو' کوئی شے دل لبھاتی نہ ہو۔ جہاں سے جلد از جلد گزر جانے کی خواہش ہو۔ دنیا اس کے لئے ایسا ہی بازار تھی۔

رات کی رانی کی مہک سے لبریز ہوا کا جھونکا کمرے میں آ گھسا۔

اس کے لبوں سے سسکی نکل گئی۔ کبھی یہ ہوا کتنی روح پرور لگا کرتی تھی' کبھی یہ مہک تن من کو جذبوں سے مہکا دیا کرتی تھی۔ کبھی پورے چاند کا منظر کیسا سرور عطا کرتا تھا اور آج ہر اچھی خوبصورت بات دکھے دل کو مزید دکھی کیا کرتی تھی۔ آج درد کا کچھ درمان نہ تھا۔ پورا چاند مکمل ہوا' ساتھ لینا من چاہا جیون ساتھی' کچھ بھی اس کے دل کو خوشی نہ بخشتا تھا۔ درد بڑھانے کو ایک چبھتا فقرہ ہی کافی ہوتا تھا۔ صبح ہی تو اماں کہہ رہی تھیں۔

''یہ موا آم کا درخت تو بالکل ہی کام سے گیا۔ لوگوں کے درختوں سے بھر بھر بور آیا ہے اور اس کو دیکھو کیسا ننگا بچا کھڑا ہے۔ اب کی بار اس کو کٹوا ہی دوں' دوسرا پودا لگواؤں گی۔''

اور بھابھی نے اسے سیڑھیوں کے پاس کھڑا دیکھ کر مسکرا کر کہا تھا۔

''اماں! کہیں آپ کی منجھلی بہو کا سایہ تو نہیں پڑ گیا اس پر بھی؟''

آہ...... ایک جملہ ہی تھا' چند الفاظ ہی تھے مگر کیسی قیامت بپا ہوئی تھی اس کے دل و دماغ میں کہ آنسو پوری رات بہتے ہی رہے۔ سسکیاں سینے میں گھٹتی رہیں' ہچکیاں گلے میں اٹکتی رہیں۔

ہر چند کہ اماں نے اپنی بات پہلے کہی تھی اور فاخرہ بھابھی نے بعد میں مگر اسے نجانے کیوں وہم سا پڑ گیا تھا۔ کہ بھابھی نے جملہ پہلے ادا کیا تھا اور اماں نے وہ دھمکی بعد میں دی تھی۔

''اب کی بار اسے کٹوا ہی دوں' دوسرا پودا لگواؤں گی۔''

نجانے اماں کا کیا مطلب تھا۔ نجانے وہ آم کے درخت کی ہی بات کر رہی تھیں یا پھر...... یا پھر...... اس کا سر چکرانے لگا' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ارے مرد کو اللہ نے چار کی اجازت دی ہے تو کوئی مصلحت ہی ہو گی نا۔'' اماں اکثر اسے آس پاس دیکھ کر کہا کرتی تھیں۔

''بے چارہ اشعر!'' فاخرہ بھابھی سناتیں۔ ''مرد اپنے بچے کو گود میں لے تو ذرا اس کا چہرہ دیکھا کرو' کبھی دیکھی ہے وہ روشنی اشعر کے چہرے پر؟''

''ان کے ساتھ نجانے کیا پرابلم ہے؟'' شہ پارہ کہتی۔ ''ہم تو تم سے منصوبہ بندی بھی کریں تو وہ بھی ناکام ہو جاتی ہے۔''

اس کے ساتھ کیا پرابلم تھی' وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ آج سے چند سال قبل وہ اور اشعر اپنا مکمل میڈیکل چیک اپ کروا چکے تھے۔

اشعر ہر لحاظ سے صحت مند اور باپ بننے کے لائق تھا لیکن اس کے اندر مادہ اعضاء کی نمو پوری طرح نہ ہو پائی تھی۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

اس خبر نے اس کی ہستی کے ہر تار کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ گونج اب تک اس کے خون میں رواں تھی۔

وہ کمرہ' وہ میز' وہ میز کے پیچھے بیٹھی وہ ڈاکٹر' اس کے گلے میں لٹکتا اسٹیتھسکوپ اور

اس کا اس لمحے ادا کیا گیا جملہ...... ایک ایک شے اس کے حافظے پر نقش تھی۔

''آئی ایم ساری ٹو سے دیٹ...... مگر حقیقت یہی ہے مسز اشعر...... آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔''

''آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔''

اس کے لبوں سے ایک کراہ نکلی۔ ڈر کر اس نے اشعر کی جانب دیکھا' وہ اسی لمحے جاگ گیا تھا۔ تانیہ نے جلدی سے آنکھیں میچ کر کروٹ بدل لی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اشعر کی نیند خراب ہو' اس سے زیادہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اشعر کا دل خراب ہو' اسے روتا پا کر وہ ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔

''تانیہ!'' اشعر کا ہاتھ اس کے کاندھے پر آ رکا۔ اس کی ہتھیلی میں نیند کی حدت تھی۔ وہ محبت بھری تپش اس کے سرد وجود کو سکون بخشنے لگی۔ آنسو پوری روانی کے ساتھ اس کی گردن پر لکیر بنانے لگے۔

اشعر نے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

''اوہ...... مائی گاڈ!'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ''تانی...... میری زندگی! کب سے رو رہی ہو۔'' سارے اختیار کھو کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

اشعر نے اسے اٹھا کر اس کا سر شانے سے لگا لیا اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

''بس یار...... بس کرو...... پلیز......''

وہ اٹھا اور روم فریج سے ٹھنڈا پانی لے کر آیا۔

''خود بھی مر جاؤ گی اور مجھے بھی مار ڈالو گی تم...... کیوں اتنی ظالم ہو...... کیوں خود پر اتنا ظلم کرتی ہو...... چار بج رہے ہیں...... صبح ہونے والی ہے...... اور تم رو رو کر خود کو مٹانے میں لگی ہو۔''

''میں مٹ جانا چاہتی ہوں اشعر......'' وہ زخمی لہجے میں بولی تھی۔ ''میرے ہونے سے کتنوں کا سکھ چین خطرے میں ہے۔''

''ان سب میں کہیں تم نے میرا نام تو شامل نہیں کیا؟'' وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔

''اب یہ مت کہہ دینا کہ تم تو ٹاپ آف دی لسٹ ہو۔ رات کے آخری پہر تم

یونہی بکنے لگی ہو۔ یاد ہے جب اپنی شادی ہوئی تھی......"

"اشعر پلیز......" اس نے سوجی سوجی آنکھوں سے التجا کی۔ "میرا دل اب ان کھلونوں سے نہیں بہلتا۔ بھول جاؤ ان سب باتوں کو' مجھے' مجھ سے وابستہ ہر شے کو...... بھول جاؤ اشعر......"

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں پھر کہتی ہوں اشعر......" باقی بات کہنے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے دانتوں سے نچلا لب دبا لیا۔ وہ جب بھی یہ بات کہتی تھی اس کا ردعمل بڑا شدید ہوا کرتا تھا۔

"بولو...... تم خاموش کیوں ہو گئیں۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔

تانیہ نے سر جھکا لیا۔

"بولو تانی! کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے پھر میں جانوں اور میرا دل۔" وہ لب کاٹتا اسے ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا اور یہ بات اس نے کبھی اشعر کو نہیں بتائی تھی۔

"اشعر!" وہ اسے محبت سے دیکھ کر بولی۔

"بولو۔" اس نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی۔

"اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

"مجھے صرف وہ راستہ پسند ہے جس پر تم میرے ساتھ ہو اور میں اسی راستے پر چل رہا ہوں۔"

"یہ راستہ...... پتھروں سے' کانٹوں سے' طعنوں سے' تشنوں سے اٹا پڑا ہے اشعر!" وہ سسکی۔ "اور میں ننگے پاؤں اس پر خار رستے پر نجانے کب سے چل رہی ہوں۔ میری روح تک زخمی ہو چکی ہے۔"

"تمہیں اپنے ساتھی پر بھروسہ نہیں ہے۔ تانیہ!" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگا۔ "تم مجھ سے زیادہ لوگوں کی پروا کرتی ہو' تمہیں میری خوشی عزیز نہیں ہے۔ ذرا سی باتوں سے گھبرا کر مجھ سے جدا ہونے کی بات سوچ لیتی ہو۔ اچھی محبت ہے تمہاری......"

"مجھے تمہاری خوشی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ اشعر......!" اس نے اشعر کا ہاتھ

تھام لیا۔ "اور میں تمہاری خوشی کے لئے ہی کہتی ہوں...... دوسری شادی کر لو۔"

اشعر نے ہاتھ چھڑوا لیے۔

"بس کرو' سو جاؤ۔"

"اشعر...... میں...... میں یہیں رہوں گی تمہارے پاس' تمہارے بچے اپنے بچوں کی طرح پالوں گی' ان سے اپنی جان سے زیادہ پیار کروں گی۔ ان کی ماں کو اپنی محبت سے جیت لوں گی۔ اسے بہنوں کی طرح چاہوں گی۔ اشعر......"

"میں نے کہا تھا نا' رات کے آخری پہر تم بہک جاتی ہو۔" وہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ "مجھے صبح آفس جانا ہے' میں تمہاری اول فول مزید نہیں سن سکتا۔"

"اشعر! میری بات تو سنو۔"

"کیپ کوائٹ تانیہ!"

اس نے ہاتھ بڑھا کر بتی بجھا دی۔

✿ .... ✿ .... ✿

وہ اشعر کی خالہ زاد تھی۔ خدا نے جیسے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا تھا۔ اس نے میٹرک کیا تھا' جب عین رزلٹ والے دن منیزہ خالہ اس کے لئے چار جوڑے اور ایک خوبصورت انگوٹھی لے کر آ پہنچی تھی۔

تانیہ کے والدین تو شروع ہی سے اس رشتے کے حق میں تھے۔ اشاروں' کنایوں میں کئی مرتبہ یہ بات ہو چکی تھی پھر اشعر کی بولتی نگاہوں سے کتنی ہی مرتبہ خوشبو جیسے پیام بھیجے تھے۔ تانیہ اس کے حال دل سے واقف بھی تھی اور خود شریک حال بھی۔

خالہ کی پہنائی ہوئی انگوٹھی اشعر کے دل کی طرح چار سال اس کے وجود سے لپٹی رہی۔ چار سال بعد وہ اپنا وجود اس کے نام لکھ کر اس کے من آنگن میں خوشبو کی طرح آ بسی۔

اشعر اپنے والدین کا سب سے لائق' سب سے خوبرو اور چہیتا بیٹا تھا۔ ہر چند کہ اس سے بڑا بھائی انور بھی تھا اور چھوٹا احمر بھی لیکن جو محبت اشعر کے حصے میں آئی تھی' وہ کسی اور کی قسمت میں کبھی نہ بنی۔ یہی محبت تانیہ نے بہو بن کر سمیٹی۔ اس سے پہلے فاخرہ بھابھی

اس گھر میں موجود تھیں۔ دو بیٹوں کی ماں ہونے کا تمغہ ہمہ وقت ان کے سینے پر سجا رہتا تھا۔ پیشانی پر بڑی بہو اور بڑے خاندان کی بیٹی ہونے کا فخر چمکتا تھا۔ پھر بھی جو استقبال گھر میں تانیہ کا ہوا اس سے ان کے غرور کا چراغ مدھم پڑ گیا۔

تانیہ کا جوہر خاص اس کی خوش خلقی تھی۔ اس کی آواز میں کوئل کی سی مٹھاس اور سر تھا پھر وہ بولتی بھی بڑے دلکش انداز میں تھی۔ نرم و ملائم لہجے میں وہ جب دل موہ لینے والے الفاظ میں گفتگو کرتی تو چھوٹے بڑے اس کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

پھر حسن میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ کمر سے نیچے آتے سیاہ ریشمی بال اس کا خزانہ تھے۔ وہ ان کی جی جان سے حفاظت کرتی۔ بھنورے کی سی آنکھیں اور سنہری دمکتی رنگت۔ خدا نے اسے کئی خوبیوں سے نوازا تھا۔

اشعر تو پہلے ہی اس کا دیوانہ تھا۔ اس کے مل جانے کے بعد تو وہ خود کو بھی بھول گیا۔ خالہ کی چہیتی بھانجی تھی، پھر بڑی بہو سے اتنے سالوں میں کئی اختلافات ہوئے تھے۔ انہوں نے جان بوجھ کر بھی تانیہ کا پرزور استقبال کیا تھا۔

فاخرہ بھابھی نے پہلے دن سے ہی اس کے لئے جذبۂ رقابت محسوس کیا تھا اور چند سالوں میں تو وہ اس کی روایتی حریف بن گئی تھیں، چنانچہ احمر کے لئے انہوں نے اپنے خاندان کی لڑکی چنی اور اپنی کزن شہ پارہ کو بیاہ کر لے آئیں۔

تانیہ کو خاندانی سیاست سے مطلب نہ تھا۔ وہ اشعر کی محبت کو مضبوط اور جاوداں حصار میں خود کو ہر طرح سے محفوظ خیال کرتی تھیں۔ ساس سسر اور نند اس کے دیوانے تھے۔ اس کے قصیدے ہر جگہ پڑھا کرتے، اس کی راجدھانی کو کسی حریف سے خطرہ نہ تھا۔

وہ خود میں مگن، بے پروا، خوش خوش رہا کرتی۔ تب ایک دن زندگی کی حسین، پرسکون جھیل میں خوشی کے ان گنت کنول کے پھولوں کے درمیان اضطراب اور بے چینی کا پہلا پتھر روایتی حریف کی جانب سے آیا تھا۔

''اماں.....!'' اس مہینے کی بارہ کو تانیہ اور اشعر کی شادی کی تیسری سالگرہ ہے۔ ہے نا۔'' مٹر کے دانے نکالتی فاخرہ بھابھی قدرے ہلکے پھلکے انداز میں بولی تھی۔

''ہاں۔'' اماں نے حساب لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ لوگ..... کہیں..... اب تک..... میرا مطلب ہے شہ پارہ کی پریگننسی کا تیسرا مہینہ چل رہا ہے۔ اس کے بیاہ کو کل پانچ ماہ ہوئے ہیں، یہ لوگ شاید اس الجھن میں پڑنا نہیں چاہتے۔''

اماں نے لحظہ بھر کو سوچا تھا۔ قدرے فاصلے پر گلدان کے پھول بدلتی تانیہ کے ہاتھ سست پڑ گئے تھے۔

''ہوتا ہے ہوا ایسا بھی۔'' پھر اماں بے فکری سے بول پڑیں۔ ''کون سی عمریں گزر گئی ہیں۔ پورے بیس کی بھی نہیں تھی تانیہ شادی کے وقت، بعض لڑکیاں زیادہ وقت لیتی ہیں۔''

فاخرہ بھابھی بدمزہ سی ہو کر خاموش ہو گئی تھیں لیکن تانیہ کے دل میں پہلی پھانس چبھی تھی۔ اسے بڑا درد محسوس ہوا۔ رات کو بیڈ روم کی تنہائی میں اس نے اشعر سے پہلی بات یہی کہی۔

''اوہ.....'' وہ ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ ''ارے بھئی میری چھوٹی سی، ننھی منی بیوی تو چپکے سے بڑی ہو گئی اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ ماں بننے کا شوق چرایا ہے، ہاں؟''

''اشعر..... پلیز.....'' اسے اشعر کا ہنسنا اچھا نہ لگا۔ وہ مسئلے پر سنجیدگی سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ میکے میں بھی امی اور بھابھی کئی مرتبہ دبے لفظوں میں یہ ذکر کر چکے تھے۔

''کیا آپ کو بچے پسند نہیں؟''

اشعر جواب دینے کے بجائے اسے شریر نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ جھینپ کر گلابی ہو گئی۔

''اشعر..... پلیز.....'' جھکی جھکی نظروں سے اس نے التجا کی۔

''بچے تو بھئی مجھے بہت پسند ہیں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''میرے بھتیجوں سے پوچھو گھر میں سب سے زیادہ انہیں میں پیار کرتا ہوں۔''

''تو پھر..... ساری عمر بھتیجوں سے پیار کرتے رہیں گے؟'' اس نے محبت بھرا شکوہ کیا۔

''نہیں جی..... عمر بھر پیار کرنے کا وعدہ تو آپ سے ہے۔'' وہ ہنوز اسی موڈ میں تھا۔

تانیہ نے تکیہ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ ہنسنے لگا۔ تانیہ کو بھی ہنسی آ گئی۔ بات آئی گئی ہو گئی تھی۔

لیکن بات اس وقت ان کے درمیان ہی آئی گئی ہوئی تھی۔ شہ پارہ کے ہاں ننھی' گلابی سی گڑیا کی آمد ہوئی تو عزیز' رشتہ دار' ہمسائے' دوست احباب سب ہی کے منہ کھل گئے۔ جو بھی آتا وہ تانیہ پر ایک آدھ فقرہ چست کرنا اپنا فرض خیال کرتا۔ ہر طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی تو وہ پور پور چھل گئی۔

''اشعر...... مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔ مجھے اپنا چیک اپ کروانا ہے۔''

اس کی ایک ہی ضد تھی اور اشعر کو نجانے کیا وہم تھا' وہ اسے بہلاتا رہتا۔

''چلیں گے یار!'' کون سی ہماری عمریں ڈھل گئی ہیں اور پھر جن کے ہاں اولاد دیر سے ہو' ان میں بڑی انڈر اسٹینڈنگ اور محبت ہوتی ہے۔

''وہ کیسے؟'' وہ چڑ جاتی۔

''شادی کے فوراً بعد ہی جو عورتیں حاملہ ہو جائیں' وہ شوہر کو مکمل محبت اور توجہ نہیں دے پاتیں۔ ان کا دھیان بٹ جاتا ہے۔ ہر چیز میں احتیاط شامل ہو جاتی ہے۔ گھومنے پھرنے کا' سجنے سنورنے کا شوق ماند پڑ جاتا ہے' شوہر الگ بدمزہ ہوتا ہے پھر جب نووارد' وارد ہو جاتے ہیں تو پھر تو سمجھو شوہر بے چارے کا کام تمام۔ آفس سے تھکا ہارا آئے تو بیگم' بچہ تھما کر کچن میں غائب ہو جاتی ہے' وہاں سے نکلتی ہے تو بچہ لے کر پھر کسی کمرے میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہ بے چارے حیران پریشان ٹی وی آن کر لیتے ہیں۔ صبح پتا چلتا ہے ٹی وی دیکھتے دیکھتے کسی لمحے آنکھ لگ گئی تھی۔ بیگم نے چپکے سے ٹی وی بند کر کے منا بیچ میں ڈال دیا تھا۔''

تانیہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔ اشعر کی اوٹ پٹانگ باتوں اور مضحکہ خیز تاثرات نے اسے تقریباً بھلا ہی دیا تھا کہ وہ کیا بات کر رہی تھی۔

پھر ہوا یوں جو دن پر لگا کر بے فکری سے اڑ جایا کرتے تھے' ان کے پروں میں اب پہلی سی تیزی اور تازگی نہ رہی۔ بے یقینی اور اضطراب کے جھاگ اڑاتے چھینٹوں نے دنوں کے پر بوجھل کر دیئے۔ شہ پارہ تین ماہ بعد پھر حاملہ ہو گئی۔ اس کی بیٹی بہت چھوٹی تھی'

لیکن وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔

''اشعر کو بیٹا چاہئے۔ دیر کس بات کی؟ اچھا ہے ساتھ ساتھ پل جائیں گے۔''

وہ بیٹے کے لئے وظائف پڑھتی رہتی۔ تانیہ کو اماں نے اولاد کی نعمت سے سرفرازی کے وظائف دیئے تو اسے خوف سا محسوس ہوا۔ زندگی میں ایک بڑے خلا کا احساس ہوا' سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ بھی نہ ہونے کا احساس۔

وہ وظائف پڑھنے لگی۔ آس کی جوت بار بار جلتی اور بار بار بجھ جاتی۔ جس قدر خشوع و خضوع سے وہ پڑھا کرتی' اتنی ہی گھٹا ٹوپ مایوسی اسے گھیرتی چلی گئی۔

شہ پارہ نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا تو وہ تکیے میں منہ چھپا کر خوب روئی۔ اشعر ساری رات اسے دلاسے دیتا رہا۔ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھاتا رہا لیکن آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے اور نیند تھی کہ پلکوں کی دہلیز چھونے کو تیار نہ تھی۔

''میں نے بھی تو وظیفے پڑھے تھے اشعر...... ! میں نے بھی تو دعائیں مانگی تھیں۔ خدا نے اس کی دعا قبول کی' میری نامراد لوٹا دی۔''

''تانیہ! خدا کسی کی دعا نہیں لوٹاتا۔ ہر بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے' خواہ قبولیت کا انعام روز قیامت ہی کیوں نہ ملے۔ دیکھو تانیہ! دنیا میں بے شمار بے اولاد جوڑے ہیں' یہ آزمائش اللہ نے بہتوں کی رکھی ہے۔ لیکن یہ سوچو کہ اس آزمائش کا انعام بھی تو ہوگا اور اللہ کا انعام ہر نعمت سے بلند اور بھاری ہے۔ ہم اس انعام کا کیوں نہ سوچیں۔

''نہیں اشعر! نہیں...... اللہ کا واسطہ یوں نہ کہو۔ یوں کہو کہ انشاء اللہ' اللہ ہمیں بھی اولاد دے گا۔ ہمیں کبھی آزمائش میں نہیں ڈالے گا' ہمیں اپنی ہر نعمت سے نوازے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو مگر انسان کو بلند حوصلہ ہونا چاہئے اور دوسروں سے مسابقت کی دوڑ بہت تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ اولاد ہو جائے تو بیٹوں کی دوڑ' بیٹے ہو جائیں تو ان کے مستقبل کی دوڑ۔ ہمہ وقت انسان اپنے نصیب سے حالت جنگ میں رہتا ہے تانیہ! اولاد دینا نہ دینا اللہ کا کام ہے۔ اس کی اطاعت' اس کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کرنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ یوں دل کو چھوٹا نہ کرو۔''

اشعر نے اس کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر لی لیکن فاخرہ بھابھی اور شہ پارہ کے

ہنستے مسکراتے چہرے اس کے ذہن سے نہ نکلتے تھے۔

اور پھر اس نے اشعر کو میڈیکل چیک اپ کے لئے آمادہ کر ہی لیا۔

اور پھر ڈاکٹر نے اسے زندگی کی سب سے تلخ حقیقت بتائی تھی۔ جس نے اسے جینے کی خواہش سے ہی محروم کر دیا۔ کتنے دن' کتنی راتیں وہ کمرے میں بند سب کی چبھتی' سوال کرتی نظروں سے دور تکیے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔

اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ فاخرہ بھابھی کی طنزیہ نگاہوں اور تمسخرانہ مسکراہٹ کا سامنا کرتی۔ شہ پارہ کی غرور سے بھری چال اور فخریہ جملوں سے اسے تنہائی میں بھی خوف محسوس ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نگی خالہ کا بجھا ہوا چہرہ اور بھیگی پلکوں کا خیال اسے اندر سے کاٹنے لگتا۔

وہ بیمار پڑ گئی۔ تمنا کی جلتی لو کیا بجھی تھی کہ وہ راکھ بن کر رہ گئی۔ رنگ جھلس گیا' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ بال ٹوٹتے' گرتے شانوں تک آپہنچے۔ وہ آپ اپنا مذاق بن گئی۔ ایسے میں اشعر اس کے دکھی دل کا مرہم تھا۔ وہ اس کا ہم درد' ہم نفس' قدم قدم پر اس کا ہاتھ تھامے رہا۔

''ثانیہ! اللہ نے ہر انسان کو مکمل بنایا ہے۔ مجھے' تمہیں' ہم سب کو۔ کسی کا ہاتھ نہیں ہے' وہ بھی مکمل ہے۔ کسی کی ٹانگ نہیں ہے' وہ بھی مکمل ہے' اس مجسمہ ساز نے جب مٹی کے بے جان پتلے میں روح پھونکی تو سمجھو کہ اسے مجسمے کے مکمل ہو جانے کا یقین تھا۔ وہ مجسمہ کو نامکمل جانتا تو اس میں روح کیوں پھونکتا؟ اب مٹی کے اس مجسمے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنے خالق کی مرضی کو چیلنج کرے اور اسے بتائے کہ اس نے نا تمام جسم بنایا ہے۔ اس کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ جن کے پاس اولاد ہے' وہ اس اولاد کے پیدا کرنے میں بااختیار نہ تھا۔ انہیں خدا کے خزانے سے وہی ملا جو اس نے دینا چاہا۔ اب اگر وہ جھوٹا فخر و غرور جتائیں تو ان کا فخر و غرور انہی کے لئے چھوڑ دو' خود پر طاری مت کرو۔ ثانیہ! تم اپنے آپ میں تلاش کرو کہ اللہ نے ان کی اس برتری کے جواب میں تمہیں کن کن چیزوں سے فوقیت دی ہے۔ یقیناً تمہیں بہت کچھ نظر آئے گا اور پھر تم اپنے رب کا شکر ادا کرو گی۔''

اس نے اشعر کی باتوں پر توجہ دینا شروع کی تو طبیعت میں بہتری آنے لگی۔

شادی سے پہلے اس نے پرائیویٹ بی اے کیا تھا۔ اب ریگولر ایم اے میں داخلہ لے لیا۔

صبح سویرے جب وہ گھر سے اشعر کے ساتھ نکلتی تو فاخرہ بھابھی اور شہ پارہ کی دبی دبی مسکراہٹیں اس کا پیچھا کرتیں۔ وہ یوں ظاہر کرتی جیسے اس نے کسی کو دیکھا ہی نہ ہو۔ کبھی ان کا کسا ہوا فقرہ کان میں پڑ جاتا۔

''ہائے...... بے فکری کی زندگی! بچے نہ ہوں تو عورت خود ہی بچہ بن جاتی ہے۔''

''دبی دبی ہنسی تعاقب کرتی۔ اس کے کانوں میں سیسہ پڑتا۔ دل سے ٹیس اٹھتی۔''

کبھی ساس کی آہ بھری سانس پیچھا کرتی۔

''میرا اشعر......'' وہ اکثر کہا کرتیں۔ ''کیا خبر تھی......''

ثانیہ سب کچھ سن کر بہری ہو جاتی۔ گونگی تو وہ ایک مدت ہوئی بن چکی تھی۔

یونیورسٹی جا کر بھی چین نہ ملتا تھا۔ لڑکیاں' لڑکے باتوں باتوں میں نجی زندگی کے متعلق سوالات کرتے پھر وہ کاسن روم میں ترس اور ہمدردی بھرے الفاظ سنتی رہتی۔

ماں نہ بن سکنا کیا اتنا بڑا جرم ہے؟ اس روئے زمین پر عورت پر لگنے والا سب سے بڑا الزام بانجھ پن! کیوں؟ اس میں عورت کی خطا کیا' یہ تو اس خالق کا کام ہے جو عورت کو محض ایک ذریعہ بناتا ہے۔ اگر اس کام کے لئے اللہ نے اسے نہیں چنا تو وہ معتوب کیوں؟

سوچ سوچ کر وہ نڈھال ہو جاتی مگر دل میں جلتے الاؤ کو فرق نہ پڑتا۔ وہ اسی رفتار سے جلے جاتا۔

جب کوئی غم نہ تھا' وہ سوچتی نہ تھی' اب انکشاف کے نت نئے رنگ روز اترا کرتے۔ عورت کی دشمن عورت کا یہ بھیانک روپ اس کے تصور کی گرفت میں کبھی نہ آیا تھا۔ تمسخر' تضحیک' طنز' طعنے' تشنے...... اتنے تیر اپنی فطرت کے ترکش میں سمیٹے ہوئے عورت بظاہر کتنی صاف' اجلی اور معصوم ہے۔

کسی کو خبر نہ ہوتی اور اس کا دل پارہ پارہ کر دیا جاتا اور تیشہ محض ایک مسکراہٹ ہوتی۔ ایک تیکھی نظر لوگ خوش گپیاں کرتے ہوئے کسی شوگر کوٹڈ جملے میں بھرا زہر اس کی

رگوں میں اتار دیتے۔ اس کے لبوں سے آہ تک نہ نکلتی۔

اس کے سامنے بچوں کو لپٹا لپٹا کر چوما جاتا' ان کے مستقبل کی باتیں کی جاتیں۔ ''ماں'' کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا جاتا اور بانجھ پن کے تصور سے بھی اللہ کی پناہ مانگی جاتی۔

وہ لمحہ لمحہ گھلتی' قطرہ قطرہ پگھلتی' روز مرتی' روز جیتی۔ وہ کسی کی شکایت کیسے کرتی' کس کو اپنی حیات کا دشمن قرار دیتی' کس پر اپنے قتل کا الزام لگاتی؟ ٹوٹا ہوا دل نظر نہیں آتا' اندر گرتے آنسو اپنا سراغ نہیں دیتے' لمحہ لمحہ مرتی زندگی قاتل کا نام نہیں لیتی۔ ہر چند کہ قاتل نظروں کے سامنے ہی ہو۔ اس نے جانا تھا کہ جہنم کی دہکتی آگ اکثر عورتوں کا مقدر کیوں ہے۔

ذرہ ذرہ سمٹی ہوئی زندگی ایک مرتبہ پھر بکھری تھی۔

''تانیہ!''

وہ ایم اے کے امتحانات سے فارغ ہوئی تھی' جب اماں نے اسے ایک کڑی آزمائش کے سامنے لا کھڑا کیا۔

''ہم لوگوں نے بہت سوچا ہے' سب گھر والوں نے رات دن بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیا ہے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے......''

انھوں نے ایک نظر اس کے معصوم چہرے پر ڈالی پھر جی کڑا کر کے بولیں۔

''اشعر کی دوسری شادی کر دی جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس کے حواس کچھ دیر کو معطل ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا' کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ انہیں کچھ جواب دیئے بنا وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کنڈی چڑھائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اشعر...... اشعر کی دوسری شادی...... اشعر اس کی آتی جاتی سانس تھا۔ سانسیں دو انسانوں میں بانٹی جا سکتی ہیں؟ اشعر اس کے سینے میں دھڑکتا دل ہے' اپنا آدھا دل کاٹ کر بھلا وہ کیسے دے دیتی؟ اس کی ہر خوشی' ہر مسکان اشعر سے شروع ہو کر اشعر پر ختم ہوتی تھی۔

اس کی خوشیاں' اس کی مسکراہٹ اس سے طلب کر لی گئی تھیں۔

وہ زندگی کے سب سے مشکل موڑ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔

اماں' ابا جی' انور بھائی' فاخرہ بھابھی' امرُشہ' پارہ' عالیہ اور اس کا شوہر جمیل' تانیہ اور اشعر۔

اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب کوئی اہم فیصلہ زیر غور ہوتا۔

''بیٹے! اللہ نے بھی مرد کو چار عورتیں رکھنے کا اختیار دیا ہے۔ یہ اختیار بے وجہ نہیں دیا گیا' اس کے پیچھے ہزار ہا مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔'' ابا جی بول رہے تھے۔ تانیہ پلکیں جھپکے بنا آنسو بھری نظروں سے ان کا چہرہ تک رہی تھی۔ یہ وہی ابا جی تھے' جن کی بھی وہ لاڈلی بہو ہوا کرتی تھیں۔ اس کی جگہ اگر عالیہ ہوتی تو نجانے ابا جی' جمیل بھائی سے یہ سب کچھ کہتے یا نہیں۔

''نسل بڑھانا ہر آدمی کی خواہش ہے' اس خواہش کو خدا نے مرد کے دل میں پروان چڑھایا ہے۔ وقتی جذبوں کی خاطر اتنی بڑی خواہش کی قربانی دے بھی دے تو بعد میں پچھتاوے ہی اس کا مقدر ٹھہرتے ہیں اور پھر سب جانتے ہیں تانیہ سے تمہیں محبت ہے۔ ہم بھی تانیہ سے محبت کرتے ہیں...... تو ہمارا حق ہے کہ جواباً تانیہ بھی ہمیں چاہے' ہماری خواہشات کو سمجھے' تمہیں بخوشی دوسری شادی کی اجازت دے۔ یہ کوئی گناہ نہیں' خدا کا عطا کردہ حق ہے۔ انسان کا وارث ضرور ہونا چاہیے جو اس کے نام کو آگے بڑھائے۔ بیٹا! تانیہ کو ہم اس کا مقام دیں گے' اسے کوئی شکایت نہ ہو گی۔ بولو اشعر بیٹے! تمہارا کیا فیصلہ ہے؟''

اشعر نے جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر پہلی مرتبہ ان سب کے چہروں کو باری باری دیکھا۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بولا۔

''ابا جی! دوسری شادی مرد کا اختیار ہے' اس کا حق ہے لیکن مرد پر فرض نہیں ہے۔ یہ اس کے لئے ایک آپشن ہے چاہے تو اپنائے' چاہے تو چھوڑ دے' یعنی اس کی اپنی خواہش۔ اور میری خواہش صرف تانیہ ہے۔'' تانیہ کے رکے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس

نے سر جھکا لیا۔

''دوسری بات یہ کہ نسل بہت سے لوگوں سے قائم و دائم ہے۔ آپ کا نام آپ کے تین بیٹوں کو ملا' اس سے آگے انور بھائی کے دو بیٹوں اور احمر کے دونوں بیٹوں سے انشاء اللہ چلتا رہے گا۔ یعنی آپ کے نام کی نسل کو ایک میرے دوسری شادی نہ کرنے سے کوئی خطرہ نہیں۔ تیسرے یہ کہ آیا میں اپنا نام آگے بڑھانا چاہتا ہوں یا نہیں؟ تو میرا جواب ہے میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں۔ ہر انسان کو مر کر فنا ہونا ہے' مٹی میں مل کر مٹی ہونا ہے۔ اعمال کا سلسلہ وہیں رک جاتا ہے تو نام دنیا میں چلے یا نہ چلے' اس بات سے کم از کم مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرے دادا' پڑدادا کا نام مجھ سے چل رہا ہے لیکن میں انہیں نہیں جانتا صرف ان کے نام سے واقف ہوں جیسے میں اور بہت سے گزرے ہوئے لوگوں کے نام سے واقف ہوں تو پھر ان کی ارواح کو مجھ سے کیا حاصل ہے؟ میرے ہونے نہ ہونے سے کیا غرض؟ ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے اور ہمارے' ہمارے ساتھ جائیں گے۔ اس فانی دنیا میں ایک دن سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میں ضروری نہیں سمجھتا کہ میری اولاد ضروری ہو۔ اپنے بھتیجے بھتیجوں کو میں اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہوں' میری روح کی پیاس مٹ جاتی ہے۔ جس شے کی طلب' کم نہیں ہوتی' وہ تانیہ کی محبت ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا اور میرا خیال ہے اس بحث کو آج یہیں ختم بھی ہو جانا چاہئے۔ چیزوں کی تکرار مجھے پسند نہیں۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''چلو تانیہ...... ! مجھے نیند آ رہی ہے۔''

کمرے میں آ کر وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔

''اشعر...... اشعر...... اشعر......'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے تکرار پسند نہیں' وہ ایک ہی نام کی تکرار کئے جا رہی تھی۔

اس کا بس نہ چلتا تھا' وہ خود کو اس پر سے وار دے۔ خوشبو بن کر اس کے وجود میں سما جائے۔

''تانیہ! تم سے بھی مجھے ایک بات کہنی ہے۔''

اشعر نے اسے اٹھاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔

''اللہ نے انسان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا' اپنی مرضی کی خوبصورتیاں دیں' اپنی مرضی کی محرومیاں بخشیں پھر انسان کی مرضی بنائی کہ وہ اللہ کی مرضی میں خوش ہے یا ناخوش۔ دونوں اختیار انسان کو بخش دیئے' اس لئے انسان اگر خود چاہے تو کوئی محرومی' محرومی نہیں۔ کوئی ناخوشی' ناخوشی نہیں' اس لئے اللہ کی رضا میں خوش رہو گی تو کوئی تمہیں ناخوش نہیں کر سکتا اور لوگوں کی خواہشات پوری کرنا چاہو گی تو کوئی تمہیں خوش نہیں کر سکے گا' سمجھیں۔''

اس نے روتے روتے مسکرانے کی کوشش کی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اشعر نے ہولے سے اس کے گال پر چپت لگائی تھی۔

کچھ عرصہ اور بیتا' تانیہ کے رستے ناسور کا منہ کچھ عرصے کے لئے بند ہوا تھا کہ شہ پارہ نے ایک اور بچی کو جنم دے کر گھر کی خاموش فضا میں کنکر پھینک دیا اور تو اور فاخرہ بھابھی کی رپورٹ بھی پازیٹو آ گئی۔

سرد ہوتا الاؤ ایک بار پھر دہک اٹھا۔

''شہ پارہ!'' بچی کے لئے لائے گئے گفٹس اسے دیتے ہوئے نجانے تانیہ کو کیا سوجھی تھی۔ ''شہ پارہ! ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں' تم اسے مجھے پالنے دو اسے مجھے دے دو پلیز۔'' شہ پارہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ تانیہ کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

''اسے دودھ پلا لو گی؟'' اماں بولی تھیں۔

تانیہ کا سر جھک گیا۔

''دودھ شہ پارہ پلائے اور بچی کو تم سنبھالو تو تم ماں نہیں' آیا بنو گی۔''

تانیہ کو ایسا لگا' اماں نے اسے کسی پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو اور وہ گرتی چلی جا رہی ہو۔

''دوسرے کا بچہ سنبھالنے سے وہ اپنا نہیں بن جاتا تانیہ!'' اماں اس سے سخت خفا تھیں۔ اس نے ان کا سب سے قیمتی' سب سے پیارا بیٹا اپنا بنا لیا تھا۔

''اور پھر ایک ہی گھر میں رہتے ہو تو سب بچوں کو اپنا جان کر پیار کرو' یہ تقسیم کیسی؟ ہاں اگر واقعی ماں بنا چاہتی ہو تو اشعر سے کہو' دوسری شادی کر لے۔ اشعر کا بچہ واقعہ تمہارا

بچہ ہوگا۔ خواہ سوتیلا ہی سہی۔

وہ بھاری قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اماں نے اسے اسی کی نگاہوں میں گرا دیا تھا۔

دراز کھول کر اس نے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔ یہ بوتل اس کے دکھوں کا وقتی علاج تھی۔ دو گولیاں پانی سے نگل کر وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی تھی۔

آج اس کی شادی کی دسویں سالگرہ تھی۔ وہ صبح سے تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ پارلر جا کر بال نئے اسٹائل میں سیٹ کروائے' چہرے کا مساج کروایا۔ واپسی میں ایک خوبصورت فیروزی رنگ کا لباس اور ہم رنگ سینڈل خرید لائی۔ یہ اشعر کا پسندیدہ رنگ تھا۔

اشعر کے آنے سے کچھ دیر قبل وہ نہا کر تیار ہو گئی۔ کلائیوں میں بھر بھر کر چوڑیاں پہنیں۔ آنکھوں میں کاجل بھرا۔ ہونٹ لپ اسٹک سے سجائے۔ اشعر کا گفٹ کیا ہوا ایک جیولری سیٹ پہن کر وہ بالکل دلہن لگنے لگی۔

اسی لمحے دروازہ کھول کر وہ اندر آیا تھا۔

''السلام...... و...... علیکم......'' وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ''ہم...... کہیں جا رہے ہیں' کوئی دعوت ہے؟''

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔

''کیا خبر تھی...... ایک دن...... ایسا بھی آئے گا......'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ ''جب مجھے تم کو یاد دلانا ہوگا...... کہ......''

''او گاڈ!'' اسے اچانک سب یاد آ گیا۔ ''اوہ مائی گاڈ...... آئی ایم ویری سوری تانیہ! ویری سوری۔'' اس نے تانیہ کو پکڑ کر ایک چکر دیا۔

''خیر...... سب تاوان بھر دیں گے...... مائی ڈیئر...... تھوڑا سا انتظار اور کرو' میں ذرا ایک باتھ لے لوں پھر کہیں باہر چلتے ہیں' ٹھیک۔''

اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔

''میں بہت خوش ہوں تانیہ!'' وہ اس پر ایک نگاہ ڈال کر بولا تھا۔ اشعر واقعی بہت

خوش تھا۔ انہوں نے بہت پر تکلف کھانا کھایا تھا۔ ساحل پر گھومے تھے' لانگ ڈرائیو کو انجوائے کیا تھا اور خوش خوش واپس لوٹے تھے۔

''آج کا دن انجوائے کیا؟ سونے سے قبل وہ اس سے پوچھنے لگا۔

''ہاں' مگر ایک چیز رہ گئی۔''

''اوہ...... رئیلی! وہ کیا؟''

''میرا گفٹ! تم نے مجھے کوئی تحفہ نہیں دیا۔''

''آر یو سیریس؟'' وہ ہنسا۔ ''تم نے تو برسوں سے کسی چیز کا نام نہیں لیا۔ یہ آج تحفے کا خیال کیسے آ گیا۔ کہو کیا چاہئے؟''

''سوکن۔'' وہ قطعاً سنجیدہ تھی۔

''واٹ'' یہ کیا مذاق ہے؟''

''نہیں' حقیقت ہے۔ تمہیں اب دوسری شادی کرنی ہو گی اشعر...... ! کیونکہ یہ میری واحد خوشی ہے۔ اگر تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو۔'' وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''سمجھو میں تمہیں خوش نہیں دیکھنا چاہتا۔'' تانیہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بند مٹھی کھولی۔

''پھر میں موت کو ترجیح دوں گی۔'' اس کی ہتھیلی پر نیند کی گولیوں سے بھری شیشی تھی۔

''تانیہ!'' اشعر نے اس کے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ مارا پھر اسے خود سے لپٹا لیا۔

سب کے لئے یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی۔ اشعر نے دوسری شادی کے لئے ہامی بھر لی تھی۔ ابا جی اور اماں کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے تھے۔ فاخرہ اور شہ پارہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ انور بھائی اور احمر مطمئن ہو گئے تھے اور تانیہ کو ایک ناقابل فہم کیفیت کا سامنا تھا۔ اماں نے اسے چند تصویریں دیں۔

''اشعر کو دکھا دو۔ یہ لڑکیاں اچھے شریف گھرانوں کی ہیں۔ ان کے والدین دوسری شادی کے خواہش مند مرد کو دینے پر رضامند ہیں۔ اشعر سے کہو اپنی پسند بتا دے۔''

تانیہ نے لفافے میں سے تصویریں نکالیں۔ ایک کے بعد ایک دیکھتی رہی پھر سب تصویریں رکھ کر لفافہ اماں کو واپس کر دیا۔

''ان میں کوئی نہیں۔'' وہ اطمینان سے بولی تھی۔

''کیا مطلب؟'' اماں حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

''اشعر کے ساتھ جچے گی کوئی؟'' وہ الٹا انہی سے پوچھنے لگی۔ ''اشعر کی دلہن اشعر کی نہیں' میری پسند سے آئے گی اور میں اشعر کے لئے چاند تک توڑ لانے کی تمنا رکھتی ہوں۔''

''ہونہہ! سوکن پسند کرو گی۔ اتنا بڑا دل ہوا ہے کسی عورت کا آج تک۔ ہر لڑکی ریجیکٹ کرتی جاؤ گی کہ اسی بہانے وقت ٹلتا رہے گا۔''

وہ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔ اس کے لبوں پر وہی ناقابل فہم مسکراہٹ تھی۔

''اشعر کے لئے اشعر جتنی اچھی لڑکی ہونی چاہئے۔ دس برس پہلے وہ چوبیس سال کی عمر میں دولہا بنا تھا۔ ابھی محض چونتیس برس کا ہے۔ وقت اسے چھو کر نہیں گزرا۔ کیا کمی ہے اس میں جو اسے اچھی دلہن نہ ملے گی۔ میں اس کے لئے حوروں جیسی دلہن لاؤں گی تاکہ بچے خوبصورت ہوں۔ میں انہیں خوب پیار کروں گی' وہ اپنی ماں سے زیادہ میری محبت کو مانیں گے اور اشعر...... اشعر جانے گا کہ اس کی تانیہ کا دل کتنا بڑا ہے' میرا اشعر ہمیشہ میرا رہے گا۔''

❁ .... ❁ .... ❁

وقت گزرتا رہا' اسے کوئی لڑکی پسند نہ آتی تھی۔ ہر کسی میں وہ کوئی خامی ڈھونڈ لیتی۔ اشعر ہنس کر اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا۔ سب گھر والوں نے اس کو ڈرامہ بازی کا نام دیا۔ تانیہ کو گھنی اور مکار کے القابات سے نوازا گیا۔ وہ سنی ان سنی کرتی گئی۔

ایک روز وہ کتابوں کی دکان پر کھڑی اپنا پسندیدہ ماہنامہ لے رہی تھی۔ جب اس لڑکی پر نظر پڑی۔ تانیہ چند لمحوں کے لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔ دس سال پہلے والی تانیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہی شہد رنگت' وہی سیاہ گھور آنکھیں' وہی دلکش مسکراہٹ' وہی گال میں پڑتا گڑھا۔

وہ سب کچھ بھول کر اس کی سمت بڑھ گئی۔

''ایکسکیوز می۔ میرا نام تانیہ ہے۔ آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے' یاد نہیں آ رہا۔ آپ کا نام جان سکتی ہوں؟''

''قندیل!'' وہ مسکرا دی۔ ہر طرف جگمگاہٹ سی پھیل گئی۔

''کہاں رہتی ہیں؟''

وہ بڑی سادی لڑکی تھی جواباً اپنا پتا تفصیل سے بتا دیا۔

''ایک بات کہوں' اگر آپ برا نہ مانیں۔ اگر آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں تو پلیز۔'' قندیل کی نگاہوں میں چمک سی ابھری۔ لڑکیاں ایسی باتوں کا مطلب خود ہی سمجھ جاتی ہیں' اس نے اپنا نمبر ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھ کر اسے تھما دیا۔ وہ خود بھی تانیہ کے چہرے مہرے اور لباس وغیرہ سے کافی مرعوب نظر آتی تھی۔

تانیہ وہ چھوٹا سا کاغذ مٹھی میں دبائے دکان سے نکل آئی۔ وہ بے حد خوش نظر آتی تھی۔

❁ .... ❁ .... ❁

قندیل ایک یتیم لڑکی تھی۔ اس کے ماں باپ عرصہ ہوا انتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنی بیوہ خالہ کے پاس رہتی تھی جو سلائی کر کے اپنا اور اس کا بوجھ اٹھاتی تھیں۔

خوبرو' جوان اور اچھی پوسٹ پر فائز اشعر کا رشتہ انہیں ایک نعمت غیر مترقبہ کی مانند لگا جسے خالہ بھانجی کے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہیں تانیہ کے ہونے نہ ہونے سے غرض نہ تھی۔ قندیل کو اس کے ساتھ ایک گھر میں رہنے پر مطلق اعتراض نہ تھا۔ یہ رشتہ فوری طور پر منظور کر لیا گیا۔

تانیہ بہت خوش تھی۔ اس نے اشعر کے لئے بہترین انتخاب کیا تھا۔ ''قندیل سے اچھی لڑکی بھلا مل سکتی تھی اماں کو۔ چاہے کنوؤں میں بانس ڈلواتیں یا چراغ لے کر پھرتیں۔ اشعر کے دل میں میری قدر و منزلت کس قدر بڑھ جائے گی' جب وہ قندیل کو دیکھے گا۔ اس کے ساتھ وقت گزارے گا تو میرا خیال پل پل اس کے ساتھ رہے گا۔''

وہ شادی کی خریداری کرنے لگی۔

''اشعر کی دوسری سہی' قندیل کی تو یہ پہلی شادی ہے۔'' اس نے کہا تھا۔ ''اسے احساس نہیں ہونا چاہئے کہ وہ ''نمبر دو'' ہے۔''

فاخرہ بھابھی اور شہ پارہ حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی تھیں۔ تانیہ کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

پھر سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ دلہن کے ملبوسات ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ تانیہ نے اپنے آدھے سے زیادہ زیورات بری میں رکھ دیئے تھے۔

''میں اپنا اصلی اور سچا زیور اسے دے رہی ہوں۔ یہ سونا چاندی کیا چیز ہے۔'' وہ متانت سے بولی تھی۔

حق مہر پانچ لاکھ روپے سکہ رائج الوقت رکھا گیا تھا۔ یہ بھی تانیہ کی ضد تھی۔

اشعر بس خاموشی سے اس کی باتیں مانتا چلا گیا تھا۔ وہ ان دنوں کوئی روبوٹ لگتا تھا۔ احساس و جذبات سے عاری انسان۔ بس اس کی خاموش نظروں سے عجیب سا دکھ جھلکتا تھا پھر وہ دن آن ہی پہنچا۔ سب لوگ زور و شور سے بارات لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تانیہ نے اپنا بیڈ روم بھی نئی نویلی دلہن کے لئے سجا دیا تھا۔ خود وہ نچلی منزل پر اماں کے کمرے کے برابر والے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی۔ ہر چند کہ اشعر نے اسے بہت منع کیا تھا مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔

''اشعر...... یہ کمرہ نئے شادی شدہ جوڑوں کے لئے کتنا اچھا ہے نا...... یہ کھڑکی جو چاند کو کمرے میں اتار لاتی ہے' باغیچے کی مہکتی' نرم ہوا کا رستہ ہے۔ رات گئے اسے کھڑکی میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرنا کتنا اچھا لگتا ہے پھر نیچے والوں کا شور شرابا اس کمرے تک نہیں آتا۔ ڈسٹربنس نہیں ہوتی اور پھر......''

وہ آنکھوں میں بھرتے آنسوؤں پر قابو پا کر کچھ دیر کو خاموش ہو گئی تھی۔

''اور پھر...... کمروں سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

❁ ❁ ❁

اس نے اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ جلدی جلدی آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے سمیٹ کر وہ اندازہ لگانے لگی کہ کمرے میں کون داخل ہوا تھا' اتنی فرصت کسے تھی؟

''تانیہ!'' اشعر کی آواز پر اس کی سسکی نکل گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس شخص سے آنسو چھپانے کی اب کچھ خاص ضرورت نہ تھی۔

''رو رہی ہو تانیہ! یہ تو تم نے اپنی خوشی کی قیمت رکھی تھی پھر یہ آنسو؟''

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں اشعر!'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''تمہارا گھر پھر نئے سرے سے بس رہا ہے۔ کچھ ہی عرصے بعد تم باپ ہو گے...... میں...... سوتیلی ہی سہی...... ماں کہلاؤں گی۔''

''تم تیار نہیں ہوئیں تانیہ!'' وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ ''میری بارات لے کر نہیں چلو گی۔ تمہیں تو اس موقع پر آگے آگے ہونا چاہئے۔ تانیہ!''

تانیہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔ بلیک سوٹ میں میرون ٹائی اور جیب میں سجے میرون رومال کے ساتھ وہ حد درجہ وجیہہ لگ رہا تھا۔ سیاہ خاموش آنکھیں اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

''اشعر......'' وہ بے اختیار ہو کر اس کے سینے سے جا لگی۔ ''اشعر...... خدا کے لئے...... تم تو میرا مذاق مت اڑاؤ۔ ہاں! یہ قربانی میں نے اپنی مرضی سے دی ہے۔ لیکن چھری تلے میں آنکھیں بھی کھلی رکھوں' کیا یہ بھی ضروری ہے؟ مجھے آنکھیں تو بند کر لینے دو پھر شوق سے چھری چلاؤ۔''

وہ اس سے الگ ہو کر دیوار سے جا لگی۔

''جاؤ اشعر...... سب لوگ تمہارے منتظر ہیں۔ وہاں دلہن تم لوگوں کی منتظر ہو گی۔ دلہن کے دل کو کیسے کیسے دھڑکے ہوتے ہیں' میں جانتی ہوں۔ ہر آہٹ پر کیسے گمان جاگتے ہیں' مجھے سب پتا ہے۔ جاؤ اشعر!''

وہ مڑی تو کمرہ خالی تھا۔ اشعر نئی دلہن کو بیاہنے جا چکا تھا۔

❁ ❁ ❁

نجانے کتنے لمحے سرکے' گھڑی کی سوئیاں کتنی بار گھومیں۔ وہ بے جان' بے حرکت' بستر پر پڑی رہی پھر باہر پچھلی رات کو ہوش آیا' ہنگامے جاگے' شور و غل گھر میں پھیل گیا۔

نئی دلہن گھر آئی تھی۔

تانیہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے روزِ حشر آ گیا ہو۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

عورتیں دلہن کو سیڑھیاں چڑھا کر اوپر کی منزل پر واقع کمرے میں لئے جا رہی تھیں۔ ہنسی کی آوازوں سے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ کسی نے اس کو نہیں دیکھا کسی نے دیکھا بھی تو نظریں چرا لیں۔

وہ یک ٹک لال شرارے میں لپٹے وجود کو اوپر جاتا دیکھ رہی تھی۔

دس برس کا منظر یوں نظروں کے سامنے ایسے آ کھڑا ہوا تھا جیسے کل کی بات ہو۔

سرخ اناری رنگ کے کپڑوں میں ملبوس' ہونٹوں پر شرگیں مسکراہٹ سجائے وہ یونہی سیڑھیاں طے کر کے اوپر کمرے میں گئی تھی۔

''تانی...... یہ تم ہو؟'' اشعر مبہوت ہو گیا تھا۔ ''یہ رنگ روپ' یہ مسکراتا وجود واقعی میرا ہے۔''

اس کی جھکی پلکوں پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

''آج سے میری ہر تان تم پر ٹوٹے گی تانی!''

اور وہ دونوں زور سے ہنس دیے تھے۔

تانیہ روتے روتے ہنس دی پھر چونک کر آنسو صاف کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ خالی کمرہ اس کا دل چیرنے لگا' دیواریں منہ کو آنے لگیں۔ پچھلے دس برسوں میں وہ کبھی اکیلی نہ سوئی تھی۔ اشعر کہیں بھی ہوتا' کہیں بھی جاتا' رات کو ہر حال میں پلٹ آتا تھا۔ وہ کبھی اپنے میکے میں رات نہ رکی تھی۔ اُسے اپنے کمرے اور جیون ساتھی...... دونوں کے بنا نیند نہ آتی تھی۔

اور آج جدائی کی پہلی رات تھی۔

وہ تنہا بیٹھی سسک رہی تھی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔

''تانیہ!'' اس کے پیچھے آواز ابھری تھی۔

اسے یوں لگا جیسے یہ اس کا وہم ہو' بھلا اشعر اور اس وقت۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹی۔ اشعر اس کے پیچھے کھڑا تھا' اس کے پسندیدہ لباس میں۔ سفید کرتا شلوار اس پر کتنا جچتا تھا۔ وہ اسے بس دیکھتی رہ گئی۔

''تانیہ!'' اس نے تانیہ کے برف جیسے سرد ہاتھ تھام لیے۔

تانیہ نے اس کا ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔

''اشعر...... تم یہاں کیوں آئے؟''

''بس ایک نظر تمہیں دیکھنے۔''

تانیہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ بس ایک نگاہ کی خیرات دینے آیا تھا۔ وقت کی ساری دولت اب وہ کسی اور کے نام لکھ چکا تھا۔

''اشعر!'' اس کے ہونٹوں پر مجروح مسکراہٹ چمکی۔ ''کیسی لگی تمہیں میری پسند۔''

''پتا نہیں میں نے تو اب تک اس کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میرے ذہن میں تو تمہاری آنسوؤں سے بھری آنکھیں نہیں نکلتیں' میں اسے کیا دیکھتا۔''

''اشعر...... اشعر......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اشعر نے گہری سانس بھر کر خود پر قابو پایا۔

''میں چلتا ہوں تانیہ...... اوہ...... میری منتظر ہے۔''

تانیہ کو یوں لگا جیسے تیز دھار خنجر کا چمکتا پھل اس کے سینے میں اترا ہے۔ اس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ وجود کپکپانے لگا۔

''اشعر...... نہیں...... نہیں اشعر...... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ خدا کا واسطہ' تم میرے پاس سے نہ جاؤ۔''

''تانیہ...... خود کو سنبھالو۔'' وہ پریشان ہو گیا۔ ''کتنا سمجھایا تھا میں نے تمہیں......''

''ہاں! اشعر! سمجھایا تھا' بہت سمجھایا تھا مگر میں پاگل ہو گئی تھی۔ میں...... میں دیوانی بن گئی تھی...... میں وفا کی دیوی بننا چاہتی تھی...... میں جھوٹی ماں بننا چاہتی تھی لیکن اب...... اب میں کچھ نہیں جانتی' کچھ نہیں۔ میں بس یہ رات چاہتی ہوں۔ میں یہ رات تمہارے ساتھ بتانا چاہتی ہوں...... تمہاری دلہن بن کر...... اشعر زندگی کی ہر رات اس کے

تو بسمہ کیوں مرتی؟

اس روز ایک عجیب بات ہوئی؟

میں صبح سویرے اپنے دروازے پر کھڑی سبزی والے سے سبزی خرید رہی تھی۔ جب میں نے بسمہ کو دیکھا...... جس گھر کے دروازے پر کھڑی وہ سبزی والے کا انتظار کر رہی تھی وہ دینو کاکا کا تھا اور پچھلے کچھ دنوں سے خالی پڑا تھا' دینو کاکا کرائے دار کی تلاش میں تھا۔

مجھے اس کا دینو کاکا کے گھر دروازے پر کھڑا ہونا عجیب نہیں لگا تھا۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔ گلی میں دودھ والے سبزی والے اور اخبار والے آوازیں لگا رہے تھے۔ ایک کونے میں وہ خاکروب بیٹھا سگریٹ نوشی کر رہا تھا' جسے ابھی گلی کی جھاڑو لگانا تھی۔ گھروں میں ابھی مرد اور بچے پڑے سو رہے تھے اور وہ موتیا کی منہ بند کلی کی مانند شگفتہ اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔

اس نے ہلکے کاسنی رنگ کا ایسا سوٹ پہنا ہوا تھا جو بالکل نیا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں کلائیاں سفید اور کاسنی رنگ کی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سلیقے سے بنی چوٹی آگے سینے پر پڑی تھی اور پتا دیتی تھی کہ بال ابھی ابھی سنوارے گئے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل بھرا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر بڑے بھلے رنگ کی لپ اسٹک تھی۔ کانوں میں چاندی کے آویزے تھے۔

میں سبزی خریدنا بھول کر اسے دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ سبزی والے نے مجھے دو تین مرتبہ پکارا۔ میں نے ہڑبڑا کر اسے پیسے دیئے اور اس سے سبزی کی ٹوکری تھامی۔ اس نے سبزی والے کو اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا تو میں مڑ کر اندر چلی آئی۔

باورچی خانے میں ٹوکری رکھ کر میں باہر نکلی تو بسمہ کا سراپا میری آنکھوں میں گھوم

کام پارک میں جمع ہونے والے لڑکوں کا تھا۔ لڑکیاں عموماً آپس میں مل کر چھوٹے چھوٹے معصومانہ کھیل کھیلا کرتیں۔ ایک دوسری کا ہاتھ پکڑ کر وہ بڑا سا دائرہ بنا لیتیں اور پھر یونہی گول گول گھومتے ہوئے نجانے کتنے گیت گایا کرتی تھیں۔ یوں گول گول ایک ہی دائرے میں گھومتے ہوئے وہ بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔ گیت کے بول اور دھن تبدیل ہو جاتے تھے دائرہ وہی رہتا تھا۔ پھر بھی وہ گھومتی جاتیں گھومتی جاتیں۔ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت وہ ایک ہی دائرے میں گھوم کر اور ایک سے گیت گا کر بھی خوش رہا کرتی تھیں۔ اس یکسانیت سے ان کا جی نہ اوبتا۔ پارک میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کا مزاج اس کے برعکس تھا۔ انہیں ہر روز کوئی نیا کھیل درکار تھا۔ وہ کبھی کرکٹ کھیلتے' کبھی فٹ بال کبھی وہ پرندوں کے پیچھے غلیلیں لئے پھرتے تو کبھی جامن گرانے کی ترکیب سوچتے۔

اسے لڑکیوں کے کھیل اچھے لگتے تھے۔ وہ انہیں دیکھا کرتا۔ ان کے کھیلوں میں سکون تھا۔ محبت تھی۔ گرہستی تھی وہ ننھی' گڑیا سی بچی اسے بے حد پسند تھی جو روز اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر وہاں آیا کرتی تھی۔ وہ گول مٹول سی بچی جب ہنستی تو اس کے کشمیر کے سیبوں جیسے گال چمکتے اور ان میں گڑھا پڑتا۔ کبھی کبھار اس کا جی چاہتا کہ وہ اس بچی کو گود میں اٹھا لے اور اسے پیار کرے۔ لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ اگر کہیں وہ رونے لگتی تو بڑا غضب ہو جاتا! اسے کہاں بچوں کو خاموش کرانا آتا تھا۔

پارک میں کھیلتے ہوئے لڑکے اسے بالکل پسند نہ تھے۔ وہ اس پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ''بابا آیا...... بابا آیا...... بڈھا بابا آیا......'' وہ اسے دیکھ کر شور مچاتے' تالیاں پیٹتے۔ وہ ان کی حرکتوں پر خاموش رہتا لیکن اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ زوردار آواز نکال کر انہیں ڈرا دے یا گھاس پر پڑا ہوا کوئی پتھر اٹھا کر انہیں مارنے کی دھمکی دے۔ لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ اگر وہ ایک مرتبہ انہیں ڈرا دیتا تو پھر وہ روز اسے ڈرانے کی نت نئی ترکیبیں سوچتے۔ اس کا پارک میں آنا دوبھر کر دیتے۔ اسے پاگل قرار دے کر پتھر مارنا واجب سمجھتے۔ سو وہ انہیں کچھ بھی نہ کہتا وہ اداس ہو کر خزاں کے موسم پر غور کرنے لگتا تھا!

صبیحہ لیبر روم میں تھی۔ واجد اور اماں باہر کاریڈور میں پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھے تھے۔ اماں کے ہاتھ میں تسبیح تھی جس کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔ ان کا منہ بھی ہل رہا

تھا۔ اور وہ خود بھی ہل رہی تھیں۔ ان کے زور زور سے ہلنے کی وجہ سے بنچ بھی ہل رہا تھا۔ اور واجد بھی۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا۔ اس کا ذہن بالکل بلینک ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا سوچے کبھی اسے صبیحہ کا خیال آتا۔ کبھی اپنے ہونے والے بچے کا۔ کبھی ہاسپٹل کے بل کا' کبھی آفس کا۔

ایک نرس بڑی عجلت میں باہر آئی تھی۔ اماں اور واجد سرعت سے کھڑے ہو گئے؟

''آپ کی مسز کی نارمل ڈلیوری پاسی بل (Possible) نہیں ہے۔ سیزر ہونا ہے' یہ دوائیں لے آئیں۔''

اس نے ایک پرچی اسے تھمائی اور واپس اندر چلی گئی۔ واجد کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ بھی سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا پوچھے۔

اماں اس کے پہلو میں ہکا بکا کھڑی تھیں۔ وہ پرانے زمانے کی خاتون تھیں۔ آپریشن کا تصور ہی ان کے لئے بعید از قیاس بات تھی۔ بھلا بچہ پیدا ہونے کا آپریشن سے کیا تعلق؟ جو چیز خدا نے فطری طور پر اتارنی ہے اس کے لئے غیر فطری طریقہ کیوں اختیار کیا جائے؟

واجد دوائیوں کا بندوبست کرنے میں لگ گیا اور اماں بیٹھی بڑبڑاتی رہیں۔ انہیں ڈاکٹر اور اسپتال والوں پر غصہ تھا جو محض جلدی کی خاطر یہ سب کر رہے تھے۔ ورنہ ان کے خیال میں تو وہ دو دن کی تاخیر بھی کوئی مسئلہ نہ تھی۔

واجد نے دوائیوں اور سیزرین کے لئے معقول رقم کا انتظام کیا۔ وہ لوٹا تو اماں وہاں نہ تھیں۔ آپریشن ہو چکا تھا۔ صبیحہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اماں اس کے پاس تھیں۔

''اماں!'' اس نے ایک نگاہ ہوش سے بیگانی صبیحہ پر ڈالی اور دوسری نظر اماں کے ستے ہوئے چہرے پر۔ اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔

''اماں!'' وہ پھر بولا۔

''بیٹی ہوئی ہے!'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولیں'' ابھی نرس دکھا کر گئی ہے!''

''اوہ!'' اسے سکون محسوس ہوا' گویا سب کچھ نارمل تھا۔

وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔

''بیٹی اور وہ بھی بڑے آپریشن سے......'' اماں کچھ خفا لگتی تھیں۔ ''روپیہ پیسہ بھی

نوچ لے۔ کس دھڑلے سے وہ اس کے شوہر پر ڈورے ڈال رہی تھی اور کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہ تھا۔

عظمیٰ سے اسے پتہ چلا تھا کہ شائلہ کو طلاق ہو گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے نباہ نہ کر پائی تھی اور سال بھر بعد ہی آزادی کا پروانہ لے کر خوشی خوشی پرانی دنیا میں لوٹ آئی تھی جہاں آنچل لہراتے ہوئے رہنا اسے بہت بھاتا تھا۔ شاید اس کے شوہر کے گھر میں ایسی کھڑکیاں نہ تھیں۔ جنہیں کھولنے پر ایسا رنگین سماں بندھ جاتا اور نظروں کے جام چلنے لگتے۔ یا شاید اس کا شوہر رنگین آنچل کی سرسراہٹ اور سیاہ چوٹی کی ہلچلی سے زیادہ کچھ چاہتا ہو اور وہ زیادہ کچھ شائلہ کے پاس نہ ہو۔ بہر طور کیا تھا اور کیا نہ تھا' یہ اس کا مسئلہ نہ تھا۔ اس کا مسئلہ وسیم تھا جو ایک فضول' بے مقصد اور گونگا عشق کئے جا رہا تھا اور دور سے نظر آتے چاند کا موازنہ اپنے طاق میں سجے چراغ سے کر رہا تھا جو اپنا خون دل جلا کر اس کے گھر آنگن کو منور کر رہا تھا!

وہ بہت خوبصورت لباس خرید کر لائی۔ گلابی رنگ کا لباس۔ ہر چند کہ اس کی قوت خرید سے کچھ باہر ہی تھا پھر بھی ماہرہ نے خود پر بہت جبر کر کے وہ لباس خرید ہی لیا تھا۔ وہ اگلے ماہ کا بجٹ اپ سیٹ کر چکی تھی مگر کہیں باہر جانے کے لئے کہے گی۔ آج کا دن اس کے لئے خاص تھا۔ آج اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ اس کے چہرے کو جلا بخش گیا تھا۔ اس نے اپنی سونے کی چین پہنی اور کانوں میں چمکتے آویزے ڈالے۔ پھر آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ آج وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ وسیم کے آنے کا وقت ہوا تو اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بار بار کچن میں جا کر پانی پینے لگی۔

دل ہی دل میں اس نے خود کو کوسا۔ آنے والا اس کا شوہر تھا جس کی ہمراہی میں وہ دو سال سے زیادہ کا عرصہ بتا چکی تھی۔ ادھر وہ طرار لڑکی تھی جو ایک اجنبی سے آنکھیں لڑانے سے نہ گھبراتی تھی اور بہت اعتماد اور ٹھسے سے کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوتی تھی۔ بھلا وہ اتنی کم اعتماد کیوں تھی کہ اپنے ہی شوہر کا سامنا کرنے کا خیال اس کا حلق خشک کر رہا تھا۔ وہ خود کو بار بار آئینے میں کیوں دیکھ رہی تھی؟ پھر اسے ایک خیال آیا۔ وہ چپکے کے روشن دان تک پہنچی اور باہر جھانکنے لگی۔ سامنے والی کھڑکی بند تھی۔ ماہرہ کو ایک گونہ سکون کا احساس

ہوا۔ آج تو وہ ضرور ہی وسیم کو اپنی جانب متوجہ رکھ سکتی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دروازے تک پہنچی تھی۔ باہر کھڑے وسیم کو دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرادی۔ وسیم کی نگاہوں میں اسے دیکھ کر توصیف کا جذبہ ابھرا تو ماہرہ کو اگلے پچھلے سب مہینوں کا بجٹ بھول گیا۔

''آج میری سالگرہ ہے.........'' وسیم کو اپنی جانب بغور دیکھتا پا کر وہ شرما ہی گئی۔

''اوہ...... مجھے دھیان ہی نہیں رہا...... ورنہ میں تمہارے لئے پھول ہی لے آتا!''

''رہنے دیں پھولوں کو...... ابھی ہم باہر جا رہے ہیں......... کھانا کھانے......'' وہ کچھ لاڈ اور کچھ استحقاق سے بولی تھی۔

''ہاں ضرور...... میں نہا کر فریش ہولوں...... پھر چلتے ہیں!'' وسیم بھی خوش نظر آتا تھا۔

ماہرہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ خود پر مغرور ہونے لگی۔ اچھا لباس پہن کر وہ بھی تو اچھی نظر آسکتی تھی۔ پھر جو بات گھر کی عورت کے اچھا لگنے کی ہے وہ ان بازاری قسم کی لڑکیوں کے حسن میں کہاں؟ افق پر چمکتا چاند تو ساری دنیا کے لئے ہوتا ہے۔ گھر کا چراغ تو بس گھر کے لئے جلتا ہے...... چاند اور چراغ کا مقابلہ کیا کرنا؟

وہ وسیم کے لئے چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر جب وہ ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لئے ڈگمگا گئی۔ وسیم کھڑکی میں کھڑا تولیے سے بال خشک کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔ ماہرہ چپ چاپ اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

''چھن'' سے اس کے اندر تمناؤں کے آبگینے ٹوٹے' شائلہ آج گلابی لباس میں ملبوس تھی۔ دور سے وہ کسی آسمانی پری سے مشابہہ لگتی تھی۔ گلابی رنگ عجب بہار دکھلا رہا تھا۔ وسیم مڑا تو اس کی آنکھیں ماہرہ کے روپ کے لئے بے مہر ہو گئی تھیں۔

''میرے سر میں درد ہے'' وہ اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر بولا ''آج ہم باہر نہ جا سکیں گے!''

اس نے اپنی ڈگری نکال کر دیکھی۔ اسے اپنی ڈگری کو آزمانا تھا۔ اپنی زنگ لگی

نام کر دینا' بس آج رات مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خدا کا واسطہ' تمہیں میری محبت کا واسطہ۔'' وہ بالکل دیوانی لگ رہی تھی۔ اشعر پریشان ہو اٹھا۔

''تانیہ! سمجھنے کی کوشش کرو' لوگ کیا کہیں گے؟''

''تمہیں مجھ سے زیادہ لوگوں کی پروا ہے' مجھ سے زیادہ۔ میں سچ کہتی ہوں' اگر تم گئے تو میں...... میں وہ سب گولیاں کھا لوں گی...... میں اپنی جان دے دوں گی۔''

اسے قرار آ گیا۔ اندر اٹھتے ابال بیٹھنے لگے۔ وہ بستر پر گر کر ہانپنے لگی۔

''اچھا میری بات سنو۔'' اشعر نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بال سمیٹے۔ ''اس کے کمرے میں خواتین میری منتظر ہیں' میں جاؤں گا تو وہ سب سونے کے لئے جائیں گی۔ تم سمجھتی ہو نا یہ بات۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھتا ہوں' جب تنہائی میسر آئے گی تو میں تمہاری طبیعت خرابی کا بہانا کر کے یہاں آ جاؤں گا۔ صبح جلدی اس کے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ کم از کم دنیا والوں کی زبان تو بند رہے گی۔''

''تم...... آؤ گے نا؟'' وہ بے یقین ہوئی۔

''میں ابھی آتا ہوں تانیہ! ناؤ ریلیکس پلیز۔''

وہ اس کا گال تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

قندیل کے کمرے میں فاخرہ بھابھی اور رشتے کی ایک اور بہن موجود تھیں۔ اس کے جانے پر وہ دونوں باہر نکل گئیں۔

وہ چند لمحے گومگو کی کیفیت میں کھڑا رہا پھر بیڈ کے کنارے ٹک گیا۔

''قندیل!'' اس نے تذبذب سے پکارا تھا۔

''جی!'' نہایت خوبصورت' سریلی آواز تھی۔ ''کہیے'' تھکے ہوئے اعصاب چونک اٹھے تھے۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔

خوبصورت' بے داغ' معصومیت سے سجا چہرہ روبرو تھا۔ عروسی لباس میں وہ قدرت کا شاہکار لگ رہی تھی۔ سرخ جذبوں سے بھرے آنچل نے چہرے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ماتھے پر سجا ٹیکا' ناک میں چمکتی لونگ اور نازک سی گردن سے لپٹا گلوبند سب کے سب اس حسن بے داغ کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ باغیچے کی جانب کھلتی کھڑکی سے ہوا

کا نرم و ملائم جھونکا' رات کی رانی کی مہک سمیٹے شرارت سے مسکراتا اندر چلا آیا۔ کمرے کی ہر شے مسکرا اٹھی' اشعر بھی۔ قندیل نے مسلسل خاموشی سے گھبرا کر نگاہ اٹھائی اور اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

اشعر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گال دھیرے سے چھوا' وہ خود میں سمٹ گئی۔ وہ حسن بے مثال اس کا تھا' وہ حسین وجود اس کے نام لکھا جا چکا تھا۔ وہ اس کی دسترس میں تھی۔

گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں...... میں آتا ہوں قندیل! سونا مت۔''

وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

❁..........❁..........❁

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو آس و نراس کی کیفیات میں جھولتی تانیہ کے مردہ ہوتے تن میں جان پڑ گئی۔

''اشعر!'' وہ دوڑ کر اس تک گئی۔ وہ اسے لئے لئے بیڈ تک چلا آیا۔ دراز سے گولیوں کی شیشی نکال کر دو گولیاں نکالیں اور پانی کا گلاس بھرنے لگا۔

''تم تھک گئی ہو تانیہ! تمہیں نیند کی ضرورت ہے' تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔ یہ لو۔'' اس نے گولیاں اس کی سمت بڑھائیں۔ وہ فوراً انہیں نگل گئی۔

''اب آرام سے سو جاؤ تانیہ! میں یہاں تمہارے پاس ہوں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

چند منٹوں میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ اشعر نے ایک نگاہ اس پر ڈالی' اس کے سونے کا یقین کیا اور جلدی سے اٹھ کر لائٹ بجھا دی پھر وہ دبے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

اور اوپر جانے کی جلدی میں وہ سوئی ہوئی تانیہ کے سرہانے سے گولیوں کی شیشی اٹھانا بھی بھول گیا تھا۔

❁..........❁..........❁

دل کا مقدمہ ہار کر

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ حجلۂ عروسی میں میری منتظر تھی۔ دروازہ بند کر کے میں چند لمحوں تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میرا دل آج عام ڈگر سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔ شعور و لاشعور میں ایک بڑی' بہت بڑی تبدیلی کا گہرا احساس بسا ہوا تھا۔

آج کے دن سے زندگی بدل گئی تھی۔ جیسے نئی زندگی شروع ہوئی تھی۔ نئی زندگی کی ابتداء اور ساتھ دینے کے لئے ایک حسین ہم سفر..... شادی' انسان کے لئے کس قدر خوش کن احساس ہے۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس تک پہنچا اور آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس کی چوڑیاں ہولے سے بجیں تو مجھے اس کے وجود میں ارتعاش کا احساس ہوا۔ لمبے' گلابی گھونگھٹ کے پیچھے چھپا وہ چہرہ اپنی رونمائی کا منتظر تھا۔

''گیتی آرا!'' میں صرف اس کا نام جانتا تھا۔ وہ کیسی نظر آتی تھی' وہ کیسے ہنستی تھی' کیسے دیکھتی تھی' کیا سوچتی تھی؟ میں کچھ نہ جانتا تھا۔

مجھے تو صرف اتنا علم تھا کہ میں نے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا اور اماں نے مجھے لڑکی پسند کر لینے کی نوید سنائی تھی۔ دو مہینے بعد وہ اسے بہو بنا کر لے آئی تھیں۔

وہ میرے لئے نا آشنا تھی' لیکن نکاح کے چند بولوں میں جو عظیم طاقت ہوتی ہے اسے میرا رواں رواں محسوس کر رہا تھا۔

''گیتی!'' میں نے اسے پکارا۔ میرے لہجے میں استحقاق تھا۔

مجھے خود پر حیرت ہوئی مجھے لگا' ہماری برسوں کی آشنائی تھی۔ میں نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور میرے لبوں پر مسکراہٹ چمکنے لگی۔

وہ میری اماں کا انتخاب تھی۔ کسی تراشیدہ ہیرے کی مانند دمک رہی تھی۔ میرے دل پر جو ایک انجانے سے خوف کا بادل چھایا ہوا تھا' چھٹ گیا۔ میں جو پورے دن کا تھکا ہوا تھا' بالکل فریش ہو گیا۔ اس کی نازک انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنا کر میں نے اس سے چند ایک باتیں کیں تو وہ قدرے مطمئن اور قدرے بااعتماد نظر آنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں نا آشنائی اور اجنبیت کی گھٹن ہماری مسکراہٹوں اور دبی دبی ہنسی کے روزن سے نکل بھاگی۔

ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے تھے۔

ہم ایک دوسرے کے بنا ادھورے تھے۔

گیتی آرا، میری زندگی کا دوسرا نام تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

''گیتی!'' میں آفس سے لوٹا تھا۔

میری عادت راسخ ہو چکی تھی۔ میں گھر پہنچتے ہی اسے آوازیں دینے لگتا تھا اور ہماری شادی کو محض دو ماہ ہوئے تھے۔

''لڑکے! پہلے پورا گھر میں داخل تو ہوا کر۔'' اماں جو صحن میں بچھے تخت پر غالباً عصر کی اذان کے انتظار میں بیٹھی تھیں' مجھے ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔

''السلام علیکم اماں۔'' جھینپنا لازمی امر تھا۔

اندر سے آتی گیتی آرا شرارت سے مسکرا دی تھی۔ میں نے اماں کی نظر بچا کر اسے لفنگوں کی طرح آنکھ ماری۔ اس نے مصنوعی خفگی سے مجھے گھورا اور کچن کی سمت مڑ گئی۔

''گیتی! بچے کو پانی پلا تھکا ہارا لوٹا ہے۔''

اماں نے نیت باندھنے سے قبل کہا تھا۔

اماں کا نیت باندھنا تھا۔ میں جھپاک سے کچن میں جا گھسا۔ وہ میرے لئے

شربت بنا رہی تھی۔

"خیر سے وکیل ہیں جناب!" وہ چینی گھولتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں می لارڈ! ہر جرم کی صفائی پیش کر سکتے ہیں' پھر بھی آپ می لارڈ ہیں۔ سزا سنا سکتے ہیں۔"

"یہ شربت پی لیجئے یہی سزا ہے آپ کی۔"

"اوہو۔" میں نے مایوس سے کہا۔ "میں سقراط نہیں ہوں می لارڈ۔ مجھے تو یا انہوں کی ہتھکڑیاں لگا کر کمرے میں قید کی سزا سنایئے۔"

"بولتے بہت ہیں آپ" اس نے مسکراہٹ دبا کر مجھے گھورا۔

"وکیل ہوں می لارڈ!"

اسے ہنسی آ گئی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔

"سزا قید کی نہیں ہے۔" پھر وہ بولی۔ "کہیں گھمانے لے کر چلیں۔"

"جو حکم جناب کا' مجرم کو لباس تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے گے۔" میں نے شربت گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"ضرور کیجئے خیالات تبدیل کرنے کی اجازت نہیں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

میں کورنش بجالایا۔

❁ .... ❁ .... ❁

گیتی زندگی کا جزو خاص تھی۔ اس کے بنا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ شادی کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ میں نے اسے میکے میں رہنے نہ دیا تھا۔ اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا۔ گھر والوں سے ملا کر اپنے ساتھ ہی واپس لے کر آیا کرتا تھا۔

اماں کو میرا یہ انداز پسند نہ آیا۔

"بختیار!" ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔

گیتی عشاء کی نماز پڑھ کر میرے لئے روٹیاں پکا رہی تھی۔

"بیٹا! شادی ہو جانے سے لڑکے کی زندگی پر اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا کہ لڑکی کی زندگی پر پڑتا ہے۔ لڑکا اپنے گھر' اپنے گھر والوں میں' اپنی جگہ پر رہتا ہے اور لڑکی! جیسے کسی

پودے کو جڑوں سمیت اکھیڑ کر کسی دوسری جگہ' نئی مٹی میں لگا دو۔

نئی جگہ بے شک پہلی جگہ سے زیادہ اچھی ہو نئی مٹی بے شک پہلی والی مٹی سے زیادہ نرم' زیادہ زرخیز ہو مگر بیٹا' پودے کو پھر سے جڑ پکڑنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ بے چارہ سہم جاتا ہے' مرجھانے لگتا ہے۔ رگوں کے ٹوٹنے کا درد دھیرے دھیرے زائل ہوتا ہے۔ لڑکے کا کچھ نہیں جاتا۔ لڑکی ماں' باپ' بہن بھائی سے بچھڑتی ہے۔ مانو نازک نازک رگیں کسی نے ایک جھٹکے میں توڑ ڈالی ہوں۔ اس درد کو محض عورت کے لئے مخصوص کیا ہے خدا نے ہاں۔"

اماں کو نجانے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ ان کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ میں خاموشی سے بیٹھا سن رہا تھا۔ جانتا تھا جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھیں' ابھی باقی تھا۔

"تین ماہ سے بچی اپنے والدین سے ماں جایوں سے دور ہے۔ تڑپتی نہ ہو گی؟"

"میں ملوا کر تو لاتا ہوں اماں!" میں نے کمزور سے احتجاج کیا۔

"پیاس کو پانی کی جھلک دکھا دو تو کیا پیاس بجھ جاتی ہے۔ بختیار؟"

میں لاجواب ہو گیا۔

گیتی آرا کھانا لے آئی تھی۔ میں اور اماں خاموش ہو گئے۔ وہ دسترخوان لگانے لگی۔ میں نے اس کی جھکی ہوئی پلکوں کو دیکھا۔ وہاں نمی چمک رہی تھی۔ غالباً میری اور اماں کی گفتگو اس نے سن لی تھی۔ میرا دل بے چین ہو گیا۔

"گیتی آرا! آؤ بیٹا تم بھی کھانا کھاؤ۔"

اماں نے اسے کھانا لگا کر واپس جاتے دیکھا' تو پکارا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے اماں! میں تھوڑی دیر سے کھا لوں گی۔"

وہ بہانہ بنا کر چلی گئی۔ میں نے سنا تھا' اس کا لہجہ بھی نم تھا۔

مجھ سے زیادہ نہ کھایا گیا۔ چند لقمے لے کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"گیتی کو چند روز کے لئے اس کے میکے چھوڑ آؤ۔ بچی تازہ دم ہو جائے گی۔"

اماں نے میرے کمرے سے نکلنے سے پیشتر آخری بات بھی کہی تھی۔

میں رات کو اپنی تمام فائلز نمٹا کر سونے کا عادی تھا۔

قدرے تاخیر سے بستر پر آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ پر دراز ہو گیا۔ وہ بے نیاز بنی رہی۔ میں نے اس کی موٹی سی چوٹی پکڑ کر اسے کھینچا۔

''ہائے بختیار! کیا کرتے ہیں؟''

''ادھر آؤ۔''

''آ جاتی ہوں۔'' وہ سرک کر میرے پاس ہو گئی۔

''کھانا کھایا؟''

''نہیں۔'' وہ قدرے تامل سے بولی۔

''کیوں؟ موٹی ہو گئی ہو کیا؟''

''بھوک نہیں ہے۔''

''کہاں چلی گئی۔ تمہارے بدلے میکے رہنے تو نہیں چلی گئی۔''

اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے مسکراہٹ چھپانا ضروری سمجھا۔

''اماں سے میری شکایتیں لگاتی ہو۔ نہیں!'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

اس نے اپنی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟''

''کیسی؟''

''شکایتیں لگانے والی؟''

''ہاں لگتی ہو گھنی سی!'' اب کے میں نے مسکراہٹ چھپا کر سنجیدگی سے کہا۔

بس لمحہ بھر کی بات تھی۔ گیتی آرا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''ہائیں۔ ارے بھئی...... اوہو......'' وکیل صاحب کے طوطے اڑ گئے۔ ''ارے گیتی ارے یار! مذاق کر رہا تھا تمہاری قسم یہ دیکھو تمہارے سر کی قسم میں تو واقعی مذاق کر رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کل تمہیں تمہارے میکے چھوڑ کر آؤں گا۔ پورے ہفتے کے لئے۔''

آنسوؤں کی لڑی یکایک ٹوٹی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچی۔

''سچ کہہ رہے ہیں؟'' وہ واقعی خوش ہو گئی تھی۔

میرا دل نجانے کیوں اداس ہو گیا۔ اس کے چلے جانے کا خیال میرے لئے سوہان روح تھا۔ وہ خوش ہو رہی تھی۔

''ہاں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں سنجیدگی سے بولا۔ پھر قدرے تاخیر سے میں نے اسے پکارا۔ ''گیتی!''

''جی؟'' اس کا لہجہ فریش ہو چکا تھا۔

''رہ لوگی میرے بغیر پورا ہفتہ؟''

''آپ روز ملنے آئیے گا۔''

''اور راتیں۔ کیسے کٹیں گی؟'' میں نے شکایتاً کہا۔

وہ کچھ نہ بولی بس مسکرا دی۔

اسے اتنا خوش دیکھ کر میں نے بھی منفی خیالات کو سر جھٹک کر باہر نکال پھینکا۔

''اچھا چلو کھانا لے کر آؤ۔'' میری بھوک جاگ اٹھی تھی۔

''اس وقت دو بجے؟'' وہ گھبرا گئی۔

''دو بجے بھوک لگی ہو تو کیا کریں۔ بھوکے سو جائیں؟''

''وکیل صاحب! اماں جاگ جائیں گی۔'' اس نے میری ٹھوڑی پیار سے چھوئی۔

''تو کیا ہوا۔ وہ پکار کر یہی پوچھیں گی نا! کون ہے؟ تم کہنا میں ہوں اماں گیتی! وہ کہیں گی اس وقت کیا کر رہی ہو؟ تم کہنا کھانا کھا رہی ہوں اماں...... بھوک لگی ہے۔''

وہ مجھے گھورنے لگی۔

''یہ کیوں نہ کہوں کہ وکیل صاحب کو بھوک ہے؟''

''اماں کہیں گی اتنی دیر تک جگائی کیوں ہو میرے بیٹے کو۔'' میں ہنسا۔

وہ مجھے گھورتے ہوئے باہر چلی گئی۔

ابھی اس نے کچن کی لائٹ جلائی ہی تھی کہ اماں کی پکار آئی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں! اماں گیتی''

''گیتی! اس وقت کیا کر رہی ہے بیٹا؟''

وہ چند لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ میرے لب مسکرا رہے تھے۔

''کھانا کھا رہی ہوں اماں۔ بھوک لگی ہے۔'' پھر اس کی آواز آئی تھی۔

اور میں تکیے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگا۔

گیتی میکے چلی گئی۔ میرا سکھ، میرا چین، میری نیندیں۔ سب ہی کچھ ساتھ لے گئی۔

میں جب اسے چھوڑنے گیا تھا تو اس کے گھر والوں نے میری اچھی بھلی دعوت کر دی تھی۔ میں گیتی کو بتا آیا تھا کہ اب میں ہفتے بھر بعد ہی آؤں گا۔

''کیوں بختیار؟'' وہ بے چین ہو گئی تھی۔ ''گھر اتنا دور تو نہیں۔''

''بات پاس اور دور کی نہیں ہے گیتی! زندگی میں کچھ اصول ہونے ضروری ہیں۔ مرد روز روز سسرال میں بیٹھا اچھا نہیں لگتا۔ بے وجہ کے تکلفات سے گھر والوں کی روٹین بھی ڈسٹرب ہوتی ہے اور روز سسرال میں دعوتیں اڑاتا مرد اپنی حیثیت کھوتا ہے۔''

مجھے اماں کی کی گئی نصیحتیں یاد آ گئی تھی۔

''کچھ سمجھیں؟'' مجھے اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر ترس بھی آیا تھا۔

''سمجھ گئی وکیل صاحب!'' اس نے سر جھٹک دیا تھا۔

اور اب اسے گئے چار روز ہو گئے تھے۔ میں ٹھیک سے سو نہیں پا رہا تھا۔ دو روز سے میں نے شیو نہیں بنائی تھی اور کل صبح ناشتے کے بعد کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے گیتی کی جدائی کا بخار چڑھ گیا تھا۔

آفس سے واپسی پر میں نے بائیک دوڑائی اور محض بیس منٹ میں اس کے میکے جا پہنچا میں نے بیل بجائی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ ہرے سوٹ میں ملبوس وہ سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''گیتی!'' میں نے اسے پیاسی نظروں سے دیکھا۔

''جی!'' اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔

''تم جانتی تھیں۔ میں آؤں گا؟''

''جی جانتی تھی۔''

''گھر چلیں۔''

''میں امی کو بتا کر آتی ہوں۔''

وہ اندر جا کر چند لمحوں میں اپنا بیگ اٹھائے واپس آ گئی۔ اچک کر میرے پیچھے بیٹھی اور مجھے تھام لیا۔ میں بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔

تمام رات ہم دونوں ہنستے رہے۔ بسا اوقات ہنسی بہت سی باتوں کا اعتراف ہوتی ہے۔

آفس میں اماں کا فون آیا تھا۔ گیتی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔

''اماں۔ اماں کیا ہوا اسے؟'' میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔ ''میں اچھا بھلا چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' اماں پرسکون تھیں۔ ''تم شام کو کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے ٹائم لیتے آنا۔''

''شام میں ابھی آ رہا ہوں اماں''

''ارے کوئی ضرورت نہیں۔ دوڑے چلے آنے کی۔'' اماں جھنا گئیں ''وکالت پڑھ گئے عقل نہ آئی۔ میں نے کہا ہے کسی لیڈی ڈاکٹر سے ٹائم لیتے آنا۔ باپ بننے والے ہو۔''

انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

میں ریسیور تھامے حواس باختہ بیٹھا رہا گیا۔

''باپ ...... باپ ...... فادر؟'' میں نے دل ہی دل میں خود کو باپ بنتے دیکھا۔ میرا دل فرط مسرت سے سرشار ہو گیا۔ گیتی میری بچے کی ماں بننے والی تھی اور اماں مجھے شام کو آنے کا کہہ رہی تھیں۔

''حد ہو گئی!'' میں اسی وقت آفس سے نکل لیا۔ راستے میں ڈھیروں پھل خرید کر میں گھر پہنچا تو واقعی گیتی کو بیماروں کی طرح بستر پر لیٹا ہوا پایا۔

"گیتی۔" میں نے قریب بیٹھ کر پیار سے اس کی پیشانی چھوئی۔ "کیا ہوا ہے؟"

"چکر آ رہے ہیں۔" وہ نقاہت سے بولی "سنک کے قریب گر گئی تھی۔"

"گر گئی تھیں؟" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "بچے کو تو کچھ نہیں ہوا؟"

ہر چند کہ میرا سوال اتنا احمقانہ تو نہ تھا لیکن اماں اور گیتی دونوں ہنس دی تھیں۔

میں اس کا خیال رکھنے لگا۔ اتنا خیال کہ بسا اوقات وہ زچ ہو جاتی اور کبھی کبھار تو اماں بھی ناراض ہو جاتی تھیں۔

صبح صبح میں اس کے لئے مالٹے کا رس نکال رہا تھا جب اماں میرے لئے ناشتہ بنانے کچن میں آئیں۔

جب سے گیتی کی طبیعت خراب ہوئی تھی میں نے اماں سے کہہ دیا تھا کہ کھانا اماں پکایا کریں۔

"بختیار!" اماں مجھے دیکھ کر چونک گئیں۔ "کیا کر رہا ہے؟"

"گیتی کے لئے جوس نکال رہا ہوں اماں!" میں اپنے کام میں منہمک تھا۔ "ہائیں تو تو بالکل ہی جورو کا غلام ہو گیا ہے۔ بختیار!" اماں تلملا ہی گئیں۔

"کیا ہے اماں؟" مجھے برا لگا۔ "وہ میرے دکھ درد کی ساتھی ہے تو کیا میں اس کے دکھ درد میں شریک نہ ہوں؟ شوہر بیوی کا خیال رکھے تو وہ جیون ساتھی ہونے کا حق ادا کرتا ہے' اس کا غلام تو نہیں بن جاتا۔"

"اچھا میرے وکیل۔ چل نکل یہاں سے۔" انہیں ہنسی آ گئی۔

میں جوس لے کر کمرے میں آیا تو وہ سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر میرا دل سخت افسردہ ہوا۔ تھوڑے سے دنوں میں گالوں کے گلاب مرجھا گئے تھے۔

"گیتی۔" میں نے پیار سے اسے جگایا۔ "لو جوس پی لو۔ پھر ناشتہ دیر سے کر لینا۔"

وہ اٹھی اور مجھے دیکھ کر سخت حیران ہوئی۔

"آپ آفس نہیں گئے؟"

"بس جا رہا ہوں۔ تمہارے لئے جوس نکال رہا تھا۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"اوہ بختیار!" "آپ تو حد کرتے ہیں۔" وہ زچ ہوئی۔ "یہ کام میں خود بھی کر سکتی تھی۔ خوامخواہ آفس سے لیٹ ہو رہے ہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں کام وام کرنے کی...... آرام سے لیٹی رہا کرو۔"

"سب کام اماں پر چھوڑ دوں؟ ان کی عمر ہے کام کرنے کی؟"

"میں کام کے لئے عورت رکھ دیتا ہوں۔ بہرحال تمہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں' خود کو بھی نقصان پہنچاؤ گی اور میرے بچے کو بھی۔"

"بہت خوب وکیل صاحب!" وہ خفگی سے جوش پینے لگی۔

سفیان ہماری زندگی میں داخل ہوا اور اماں خاموشی سے چلی گئیں۔ بیٹے کو پانے کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں اماں کی جدائی کا غم شدت سے محسوس نہ ہوا۔ ہم ایک دوسرے میں گم تھے۔ زندگی کا وہ دور' حسین ترین تھا۔ میں گیتی اور سفیان۔

زیست میں مزید کوئی طلب نہ تھی کسی شے کی کمی کا احساس نہ تھا۔ ہر جانب' ہر سو محبت ہی محبت تھی۔

سفیان سال بھر کا تھا جب گیتی کی طبیعت پھر خراب رہنے لگی۔ میں ان دنوں اپنے کام میں ازحد مصروف تھا۔ وہ بے تحاشا محنت طلب دور تھا جس پر میری آئندہ حیثیت کا دارومدار تھا۔ میری توجہ گیتی اور سفیان پر کم ہو گئی۔

"بختیار۔" اس دن اس نے سویرے ہی سویرے پکارا تھا۔

"ہوں کہو؟" میں الماری کھولے کھڑا تھا۔ آفس جانے کے لئے کپڑوں کا انتخاب کر رہا تھا۔

"یہ...... ذرا سفیان کا فیڈر بنا دیں۔ میری ہمت نہیں ہوتی اٹھنے کی۔"

"گیتی پلیز...... مجھے آج جلدی جانا ہے۔ پہلے ہی لیٹ ہو رہا ہوں۔ تم تھوڑی سی ہمت کرو جانو! میرے لئے ناشتہ بھی بنا دو۔ میں بس ابھی نہا کر نکلتا ہوں۔"

میں جھپاک سے باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر' تیار ہو کر میز تک آیا تو وہ ناشتہ

لگا چکی تھی۔

"ویلس گڈ۔ ونڈرفل لیڈی!" میں مسکرایا۔

اس کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ وہ مسکرا تک نہ سکی۔

"میں کوشش کروں گا کہ شام میں جلدی آؤں۔ ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"بختیار! ڈاکٹر کے ہاتھ میں کچھ نہیں' یہ دن تو یوں ہی کٹیں گے۔" وہ اداسی سے بولی تھی۔

"او کے جانو! چلتا ہوں اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ!" میں اس کا گال چھو کر' بریف کیس اٹھائے باہر نکل گیا۔

"اللہ حافظ!" وہ بولی تھی۔

✿ .... ✿ .... ✿

سفیان کے بعد ارما اور ارما کے بعد ایمان اور فرقان...... زندگی سے آٹھ سال یوں نکلے کہ کوئی آہٹ چاپ تک سنائی نہ دی۔

میں بیرسٹر بختیار احمد جیسے ہواؤں میں اڑتا رہا تھا۔ گیتی جیسی شریک سفر واقعی قسمت والوں کو ملتی ہے۔ اس نے کبھی گھر کی کوئی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالی تھی۔ میرے مستقبل کے لئے وہ مجھ سے زیادہ فکرمند رہا کرتی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ گیتی نے میرے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ شادی کے بعد میں نے محبت' چاہت اور فرصت کے محض دو سال اس کی جھولی میں ڈالے تھے اور اس نے اپنی محبت' چاہت اور توجہ سے ان دو سالوں کو ضرب دے کر آٹھ کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے محنت کرنے اور کام پر توجہ دینے کے لئے اصرار کرتی تھی۔ عام بیویوں کی طرح کبھی وقت کا گلہ شکوہ نہیں کیا کرتی تھی۔

میرا لائف اسٹائل بدل گیا تھا۔ میں ایک کامیاب بیرسٹر تھا۔ اسی حساب سے زندگی گزارنے کے اصول بھی بن گئے تھے۔ وقت بچانے کے لئے میں ہمیشہ جہاز میں سفر کیا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی استعمال کے لئے میرے پاس نئے ماڈل کی کرولا تھی۔ گیتی اور بچوں کے لئے دوسری گاڑی مخصوص تھی۔ میرے بچے بہترین اسکولوں میں زیر تعلیم تھے۔ گھر پر

انہیں پڑھانے کے لئے مہنگے سے مہنگا ٹیوٹر رکھا جاتا تھا۔

گیتی بڑی طریقے سلیقے والی عورت تھی۔ وہ خرچ بھی مکمل انداز میں کرتی تھی اور کفایت میں بھی ماہر تھی۔ اس کی وجہ سے میرا بینک بیلنس بھی خاصا متاثر کن تھا اور میرا گھر بھی بہترین انداز میں چل رہا تھا۔

ہاں! مگر ان تمام جھمیلوں سے گھبرا کر' کبھی کبھی دل فرصت کے وہ ہی رات دن کی تلاش کرتا تھا جو وقت کی چکا چوند میں کہیں کھو گئے تھے۔

✿ .... ✿ .... ✿

قریباً ڈھائی بجے کا عمل تھا جب میری گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے سیاہ گیٹ کو روشن کیا۔ گہرے سناٹے کو ہارن کی آواز نے چند لمحوں کے لئے چونکا دیا تھا۔

میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا اور چہرے پر ہاتھ رکھ کر چند لمحوں کے لئے ستانے کی کوشش کی۔ اتنی دیر میں چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ ڈرائیور گاڑی اندر لے گیا۔

گاڑی سے اتر کر اپنا بریف کیس اٹھائے میں اندر آیا تو منورہ جاگتی ہوئی ملی۔ وہ ہماری کل وقتی ملازمہ تھی۔

"سلام صاحب جی!" اس نے بریف کیس مجھ سے لے لیا۔

"والسلام۔" میری آواز اور لہجہ تھکن سے چور تھے۔ "تمہاری بیگم صاحبہ"

"سو رہی ہیں صاحب جی...... کھانا لگاؤں؟"

"نہیں۔" میں نے مختصراً کہہ کر سیڑھیوں کا رخ کیا۔

کوٹ کاندھے پر لٹکائے' گولائی میں اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتا' میں آنے والے کل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کل کا دن بھی انتہائی مصروفیت کا دن تھا۔ علی الصبح بیدار ہو کر مجھے ایک ضروری کیس اسٹڈی کرنا تھا۔ پھر بذریعہ پلین لاہور جانا تھا۔ وہاں میری ایک اہم میٹنگ میں شرکت از حد ضروری تھی۔ پھر شام کو واپس کراچی۔ بے حد تھکا دینے والا دن میرا منتظر تھا۔ مجھے کچھ جھنجلاہٹ سی ہوئی۔

صاف ستھرا کمرا میرا منتظر تھا۔ چمکتا فرنیچر' بے داغ' بے شکن بیڈ شیٹ' ستھرا قالین

لیکن گیتی وہاں نہیں تھی۔ وہ اکثر میری غیر موجودگی میں بچوں کے کمرے میں ان کے ساتھ سو جایا کرتی تھی۔

مجھے نجانے کیوں غصہ آیا۔

"یہ گیتی روز ہی بچوں کے ساتھ سو جاتی ہے۔ اسے کبھی تو میرا انتظار کرنا چاہیے۔" پھر اگلے ہی لمحے مجھے کل کا دن یاد آ گیا۔ میرے پاس غصہ کرنے کے لئے وقت ہی کہاں تھا؟

لباس تبدیل کر کے میں چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ ذہنی تناؤ کم کرنے کا اچھا طریقہ تھا۔

سر اٹھا کر جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو مجھے یاد آیا۔

آج چودہ اکتوبر تھی۔ میری سالگرہ کا دن۔ آج میں پورے چالیس برس کا ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر خود کو دیکھتا رہا۔ اپنا سن پیدائش یاد کر کے میں نے پھر دل ہی دل میں حساب لگایا شاید کہیں سے ایک آدھ سال کی گنجائش نکلے۔ سیدھا سادا سا حساب پھر سامنے آیا۔ پورے چالیس برس۔ نہ کم نہ زیادہ......

تولیے سے منہ پونچھتا میں باہر نکلا تو آنکھوں میں نیند بھرے، گیتی میرے مقابل تھی۔

"ارے تم کیوں جاگ گئیں؟" میں مسکرا دیا۔

"میں نے سوچا، کھانے کا پوچھ لوں!" اسے اب بھی سخت نیند آ رہی تھی۔

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ ویسے بھی منورہ جاگ رہی تھی، تم نے بے وجہ ہی اپنی نیند خراب کی۔ اچھا یوں کرو چھ بجے کا الارم لگا دو۔ مجھے علی الصبح اٹھنا ہے۔"

میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔

گیتی آرام سے ٹائم سیٹ کر کے الارم پیس میرے سرہانے رکھ دیا۔ پھر نائٹ بلب روشن کر کے لائٹس آف کر دیں اور خود بھی اپنی جگہ لیٹ گئی۔

ہر چند کہ میں بہت تھکا ہوا تھا پھر بھی گیتی کی سانسوں کے زیر و بم سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی سو گئی تھی۔

مجھے پھر یاد آ گیا۔ آج تو سالگرہ کا دن یوں دبے پاؤں گزر رہا تھا کہ مجھے خود بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ابتدائی چند برسوں میں گیتی نے اس دن کا بڑا خیال رکھا تھا۔ میں گھر لوٹتا تو اسے خصوصیت سے تیار دیکھ کر کسی خاص بات کا احساس ہو جایا کرتا تھا۔ پھر وہ اہتمام سے تیار کردہ کیک اور دیگر لوازمات میز پر سجاتی تو میں فوراً سمجھ جاتا تھا کہ اسے میری سالگرہ کا دن...... یاد ہے۔ میں اسے رات کا کھانا باہر کھلانے لے جاتا تھا اور ہم رات گئے خوش باش لوٹتے۔

یہ محض چند ابتدائی برسوں کی بات تھی بچے بڑے ہوتے گئے۔ گیتی اور میری مصروفیات بڑھتی گئیں۔ گیتی اچھی بیوی اور بہت ہی اچھی ماں تھی۔ اس نے زندگی بچوں کے لئے وقف کر دی تھی۔ ہر چند کہ گھر میں دیگر ملازم اور ایک کل وقتی ملازمہ موجود تھی لیکن میرے اور بچوں کے زیادہ تر کام وہ خود سر انجام دینا پسند کرتی تھی اور جب سے بچوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا وہ زیادہ حساس ہو گئی تھی۔

دوسری جانب میں اپنی فیلڈ میں آگے اور آگے جانے کے لئے کوشاں تھا۔ مجھ پر اچانک ہی بہت زیادہ حاصل کرنے کا بھوت سوار ہوا تھا۔ یہ جنون کسی منہ زور دریا کی مانند چڑھتا ہی چلا گیا۔

گیتی اور بچے جیسے کسی پس منظر کا حصہ بن گئے تھے۔ مجھے بس اتنا علم ہوتا تھا کہ صبح جب میں کورٹ جانے کی تیاری میں مصروف ہوتا تو گیتی بچوں کو اسکول بھیجنے کی فکر میں مبتلا ہوتی تھی اور رات گئے۔ جب میں اپنی اسٹڈی سے برآمد ہوتا تو بچے سو چکے ہوتے تھے اور اکثر یوں ہوتا کہ ان کو سلاتے سلاتے گیتی بھی ان کے ساتھ ہی سو جایا کرتی تھی۔ بچے، خاندان، رسم و رواج، تقریبات ہر طرح کی ذمہ داریاں گیتی نے بنا کچھ کہے سنبھال لی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا کہ میں اپنے بیوی بچوں کو نظر انداز کر رہا ہوں تو میں خود ہی اسے معذرت پیش کرتا۔

"آدمی کے کچھ کر دکھانے کا یہی پیریڈ ہوتا ہے گیتی! جس مرد نے عمر کے اس حصے میں محنت کر لی، سمجھو وہ ساری عمر اس کا پھل پائے گا۔ ایسے میں میری کوتاہیوں کو تمہیں نظر انداز کرنا ہی ہو گا اور پھر میں یہ سب کچھ کس کے لئے کر رہا ہوں؟ تمہارے لئے، بچوں

کے لئے۔'' گیتی سمجھدار عورت تھی۔ اس نے خود کو گھر اور بچوں میں مصروف کر لیا۔ زندگی کے خانوں میں ہم اس طرح سے بٹ گئے کہ یہ خانے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی تھے اور علیحدہ علیحدہ بھی تھے۔

لیکن نجانے کیا ہوا تھا کئی برسوں تک بے تکان محنت کرتا ہوا' بختیار احمد اچانک ہی یوں چونکا تھا جیسے پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے کسی شخص کے پاؤں میں کانٹا چبھ جانے کا احساس سا ہو جائے۔

نجانے کیوں دل میں ایک کانٹا سا کھب گیا تھا! زندگی سے' زندگی کی بے تحاشا مصروفیات سے' ذہنی بوجھ اور سخت تناؤ کی کیفیت سے میں اچانک ہی اکتا گیا تھا۔

''حیرت ہے! گیتی کو اب میری سالگرہ بھی یاد نہیں رہی۔'' سونے سے پیشتر میں نے خود سے کہا۔

✿ .... ✿ .... ✿

''ٹینشن۔ تناؤ......'' باقر نے سگار سلگاتے ہوئے مجھے دیکھا۔

''کتنے برس کے ہو گئے ہو بختیار!؟'' پھر دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے اس نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔ میں نے گہری سانس بھر کر آرام دہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''پورے چالیس برس کا۔''

''ہا' ہا' ہا۔'' اس نے ایک پر زور قہقہہ لگایا۔ ''ساری خرابی ہی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ بختیار احمد! مرد کی زندگی میں دو ہندسے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ایک چودہ کا اور ایک چالیس کا۔ چودہ برس کا ہندسہ ماؤں کے لئے خطرناک ہے اور چالیس کا ہندسہ بیوی کے لئے۔''

''واٹ ربش!'' میں نے اسے دلچسپ نگاہوں سے گھورا۔ ''مرد تو اول آخر خطرناک ہے باقر!''

''نہ' نہ چودہ برس کی عمر میں اگر ماں بیٹے کو سنبھال لے تو مرد خطرناک نہیں اور چالیس برس کو پہنچے تو بیوی کو اپنی سی کرنی چاہیئے۔''

''کیوں چالیس برس کا مرد پاگل ہو جاتا ہے۔ کاٹنے کو دوڑتا ہے؟'' میں نے

قدرے تمسخر سے پوچھا۔

''یو آر رائٹ!'' اس نے میز بجائی۔ ''چالیس برس کا مرد بات بات پر بیوی بچوں کو کاٹنے کے لئے دوڑتا ہے۔''

''ربش ... ایسا کچھ نہیں ہے۔'' میں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''آئی لو گیتی۔ آئی لو مائی چلڈرن!''

''ہاں مگر تم ایک ہی رفتار سے' ایک ہی ٹارگٹ کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گئے ہو بختیار! دیکھو یہ جو پوزیشن کی دوڑ ہے' اس کا اختتام نہیں ہے۔ اس کا اختتام تو بس قبر کے سامنے جا کر ہوتا ہے۔ مرد جب بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے تو کچھ دیر کے لئے ستانے کے لئے رکنا چاہتا ہے اور جب اس کی کوشش میں رفتار کم ہوتی ہے تو وہ ہانپنے لگتا ہے ہانپنے کے اس عمل کو ہی میں ٹینشن کہتا ہوں۔ تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جانب بھاگتے شخص کو کبھی یہ ٹینشن نہیں ہوتی۔ یہ تو ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب دل رکنا چاہتا ہو اور قدم بھاگ رہے ہوں۔''

باقر کی گفتگو میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ میں کچھ بھی بولے بنا اسے سنتا رہا۔

''تم کیریئر بنانے کے چکر میں بھاگتے گئے۔ پھر تمہیں روپیہ کمانے کی لت پڑ گئی۔ تمہاری رفتار اس قدر تیز ہو گئی کہ بیوی بچے پیچھے رہ گئے۔ تمہارے منظر ان کے مناظر سے تبدیل ہو گئے۔ ان کی دنیا تمہاری دنیا سے الگ ہو گئی اور ستانے کے شوق میں جب تم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تمہیں احساس ہوا' اکیلے پن کا' تنہائی کا۔''

میں ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے میری آنکھوں سے شاید اپنے کہے کی درستگی کا احساس ہوا۔ اس کے لب مسکرانے لگے۔

''کیا تمہیں نہیں لگتا بختیار کے گھر' خاندان' بچوں اور دیگر ذمہ داریوں میں الجھ کر تمہاری بیوی نظر انداز کر رہی ہے۔''

''لگنے لگا ہے!'' میرے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔

''اور بچے! عمر کے اس دور میں عموماً ماں باپ کی نہیں۔ اس عمر میں آسائشات کی طلب ہوتی ہے...... جو شخص یہ آسائشات فراہم کر رہا ہو' اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔''

''یعنی کسی کو عملاً میری ضرورت نہیں۔'' میں جھجکی سی ہنسی ہنس کر سگریٹ سلگانے لگا۔

''تمہیں ایک شے کی ضرورت ہے۔'' وہ پراسرار سے انداز میں مسکرایا۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''چلو تمہیں کسی سے ملواتے ہیں۔ ٹینشن کم کریں۔ تمہاری۔'' وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔

''میرے پاس محض دو گھنٹے ہیں باقر!'' میں نے قیمتی رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔

''میری فلائٹ کراچی کے لئے لیٹ ہو گئی تو میں تم سے ملنے چلا آیا۔''

''ارے چلئے جناب...... ہو سکتا ہے آپ فلائٹ ہی چھوڑ دیں۔'' اس نے زوردار ...... قہقہہ لگایا تھا۔

اس نے مجھے سحر زدہ کر ڈالا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کی سوک میں منزل تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ ایک پلازہ تھا۔ ایک قدرے پرانی عمارت۔ بارش نے جسے اچھا بھلا نقصان پہنچایا تھا۔ باقر سیڑھیاں چڑھنے لگا تو میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ غالباً تیسری منزل کے ایک فلیٹ کے سامنے رکا تھا۔

کال بیل کے جواب میں ایک بوڑھے شخص نے دروازے سے سر نکالا تھا۔ باقر کو دیکھ کر اس کے لب مسکرائے۔ اس نے دروازہ وا کر کے گویا ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

''کہاں لائے ہو باقر مجھے؟'' مجھے ایک الجھن نے آن گھیرا۔

''دعائیں دو گے بیرسٹر صاحب!'' اسے میری الجھن کی مطلق فکر نہ تھی۔ وہ یوں ہی مسکراتا رہا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر میں نے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ فلیٹ اندر سے نسبتاً کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ میں بھی اچھے ذوق کی کارفرمائی نمایاں تھی۔ ایک حصے کو سفید لڑیوں کے پردے کی مدد سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ میں ابھی لڑیوں کے موتیوں پر غور کر رہا تھا کہ یکایک لڑیاں ایک طرف ہوئیں اور وہ اندر داخل ہوئی۔ میں گڑبڑا سا گیا۔

''آداب!'' اس نے داخل ہوتے ہوئے بڑے طریقے سے کہا تھا۔

''کیسی ہو ساحرہ'' باقر مسکرا رہا تھا۔

''اچھی ہوں۔'' وہ بھی مسکرائی۔ گویا روشنی بکھر گئی۔ ''بڑے دن بعد کرم فرمائی کی۔''

''ان سے ملو...... یہ ہمارے بڑے پرانے یار ہیں۔ برسوں بعد ملے ہیں۔ بیرسٹر بختیار احمد! ہم نے سوچا کچھ دعا سلام ان کی آپ سے کروائی جائے۔''

''زہے نصیب۔'' وہ مسکرائی'' کیسے ہیں بیرسٹر صاحب! مزاج اچھے ہیں؟''

''بختیار! یہ ساحرہ ہیں! صرف نام کی ہی نہیں شخصیت کی بھی! اسم بامسمّٰی ہیں گویا۔''

میں نے سر ہلا کر تعارف کا مرحلہ مکمل کر لیا تھا۔ باقر کا یہ اقدام مجھے قطعاً اچھا نہ لگا تھا۔ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ مجھے کسی اس قسم کی عورت سے ملوانا چاہتا ہے۔ اب تک تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ کسی بہت پرانے دوست سے یا کسی اہم شخصیت سے ملوانے لے جا رہا ہے۔ وہ تو کسی اور ہی خیال میں تھا۔

''میرا خیال ہے میں چلوں باقر!'' مجھے دفعتہً کوفت نے آن گھیرا۔ ''میری فلائٹ۔''

''ابھی دو گھنٹے دور ہے۔'' اس نے میرا جملہ اچکا۔

''بیٹھیے نا بیرسٹر صاحب!'' ساحرہ ناز سے بولی۔

''اب آپ مہمان ہیں ہمارے...... اور اپنے مہمانوں کو ہم ایسے رخصت نہیں کرتے۔''

''پلیز میں لیٹ ہو جاؤں گا۔''

''ہم آپ کے لئے فلائٹ لیٹ کروا دیں گے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''یقین جانیے۔''

''بابا......'' پھر اس نے آواز دی تھی۔

''جی بی بی جی۔'' وہی بوڑھا شخص نمودار ہوا۔

''اچھی سی کافی پلوایئے...... کچھ کھانے کے لئے بھی لائیں۔ لیکن ذرا جلدی۔

بیرسٹر صاحب کی فلائٹ مس ہو گئی تو یہ سارا الزام ہمارے کھاتے میں ڈال دیں گے۔''

اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ شاید یہی میری غلطی تھی۔ اس کے ساحر نقوش عقل کے لئے بھول بھلیوں کا کام کرتے تھے۔

چمکتی سفید مانگ سے نگاہ پھسلتی پیشانی تک چلی آئی تھی۔ کمان دار ابرو مقناطیسی چمک کی حامل آنکھوں تک کھنچے آتے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے نظر ستواں تک میں پڑی ہیرے کی لونگ سے خیرہ ہوتی تو اگلے ہی پل سفید دانتوں کی جلوہ گری عقل کی نگاہ کو میچ ڈالتی تھی۔

''بیوٹی فل!'' میرے دل سے بے اختیار نکلا تھا۔

باقر کو میری دلچسپی کا اندازہ ہو چلا تھا۔ وہ بے نیازی سے اپنے بریسلیٹ سے کھیل رہی تھی۔

تمہارا غزلوں کا کلیکشن وہیں تک ہے یا اس میں کچھ اضافہ بھی ہوا ہے؟'' باقر اس سے پوچھنے لگا۔

''کئی نئے کیسٹس لائی ہوں۔ چاہیں تو حسن ذوق کو محظوظ کیجئے۔'' اس نے سامنے والے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

''میں ابھی آیا بختیار...... اپنی پسند کی چند ایک غزلیں سن لوں۔'' باقر اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔

میرے اور اس کے بیچ تنہائی حائل ہوئی تو مجھے اس کی مقناطیسیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ وہ بڑی قیامت خیز جوانی کی حامل عورت تھی۔ نگاہ پڑتے ہی دل اس کی جانب کھنچنے لگتا تھا۔

''بڑا مختصر قیام ہے آپ کا ہمارے شہر میں۔'' وہ انداز دلنوازی سے بولی۔

''شہریوں کے متعلق میرا علم کمزور تھا۔'' میں سادگی سے بولا۔

اس نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔

''پھر اب کیا خیال ہے؟''

''سوچنا ہوگا۔'' میں اس کے سحر سے بچنے کی خاطر سگریٹ سلگانے لگا۔

''ضرور سوچئے! لیکن خیال رہے۔ بسا اوقات جتنے ہاتھ پیر زیادہ چلیں بندہ اتنی ہی تیزی سے ڈوبتا ہے۔''

اسے اپنے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ تھی۔ میں مسکرا دیا۔

''ہاں...... اگر انسان تیرنا نہ جانتا ہو۔'' پھر میں بولا۔

''نہیں اگر تیراک کسی بھنور میں آن پھنسے۔''

غضب کی برجستگی تھی! میں نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی سمندر آنکھوں میں بھنور ہی بھنور تھے۔

گاڑی تیزی سے تارکول کی سیاہ سڑک پر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ باقر مجھے ایئر پورٹ تک چھوڑنے جا رہا تھا۔

ہمارے درمیان خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آ گیا تھا۔

''کچھ غلط نہیں ہے یار بختیار یہ۔'' پھر وہ بولا۔

شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کچھ خفا ہوں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہ تھا۔ میں ساحرہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔

''مرد کے لئے یہ ریلیکسیشن بہت ضروری ہے۔ گھر کی عورت اندازہ کر ہی نہیں سکتی کہ فی زمانہ باہر کی دنیا میں اپنی بقا کی لڑائی لڑتا مرد کس ذہنی تناؤ سے دوچار رہتا ہے۔ جیسے تنی ہوئی رسی پر قدم قدم بڑھاتے جاؤ...... ہر طرف ایک لڑائی ہو چومکھی لڑتے رہو۔ اسے تو بس یہ علم ہوتا ہے کہ جی یہ صوفہ یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دو یہ میز اس کونے میں رکھی ہے تو ٹھیک ہے اس کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا' مسز فلاں نے ڈنر سیٹ فلانی جگہ پر خریدا ہے بہت سستا مل گیا۔ یہ بچہ پڑھائی میں سست ہے اسے ٹیوٹر کی ضرورت ہے دوسرے بچے کو پرسنل کمپیوٹر چاہئے۔ یار یہ باتیں تو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ذہنی تروتازگی کے لئے ایک پھول سی محبوبہ کی ضرورت ہے۔ بختیار...... ! جو غزلوں پر گفتگو کرے چاندنی رات کے قصے چھیڑے ساحل سمندر پر ہاتھ میں ہاتھ دے کر دور تک جائے۔ بیوی کو تو یہ فکر آن گھیرے گی کہ ہائے پیچھے بچے اکیلے رہ گئے ہیں' کوئی ڈوب نہ جائے۔''

وہ ہنسا اور دیر تک ہنستا چلا گیا۔

''ایک بھرپور' خوشگوار زندگی کا فارمولا جانتے ہو؟''

''کیا؟'' میں جیسے کسی کنوئیں سے بولا تھا۔

''خوبصورت بیوی' دو بچے اور ایک پوشیدہ عشق۔''

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

میں رخصت ہونے لگا تو اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ دبایا۔

''ہم یاروں کے یار ہیں۔ یاروں کی راہ سجاتے ہیں۔ کھوٹی نہیں کرتے...... ساحرہ اچھی عورت ہے' تمہارا بہت خیال رکھے گی۔''

میں محض مسکرا دیا۔

✿......✿......✿

کراچی آ کر میں پھر اپنی دنیا میں اسی طرح مگن ہو گیا۔ دن رات کی وہی آنکھ مچولی جاری تھی۔ جب کام کے دباؤ اور زیادتی نے مجھے بیمار کر دیا۔ میں چند روز کے لئے ہاسپٹلائز ہو گیا' گیتی سب کچھ چھوڑ کر میرے سرہانے آ بیٹھی۔ گھر' بچے ذمہ داریاں' اس نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ اس کے دن رات میرے لئے وقف ہو گئے۔ لیکن نجانے کیوں ایک عجیب بات ہوئی تھی۔

میں اپنے قریب بیٹھی گیتی کا موازنہ' سینکڑوں میل دور بیٹھی ساحرہ سے کرتا تھا۔

گیتی بات کرتی تو میرے کانوں میں ساحرہ کی سحر انگیز آواز گونجنے لگتی۔ مجھے اس کی دلنوازی اور برجستگی یاد آنے لگتی۔ گیتی کسی بات پر مسکراتی تو ساحرہ کی دلکش ہنسی کی گھنٹیاں میرے اردگرد بجنے لگتیں۔ گیتی میرے کمرے میں چلتی پھرتی اور مجھے ساحرہ کے خدوخال کی کشش یاد آتی رہتی۔

''گیتی! چلو کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ شہر کے ان ہنگاموں سے دور۔ کچھ دن کہیں اکیلے میں گزار کر آتے ہیں۔'' ایک دن میں نے ایک عجیب سی فرمائش کی۔

وہ چند لمحے تذبذب کا شکار رہی۔

''کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟''

''بختیار۔ یہ سیزن تو بچوں کے ایگزامز کا سیزن ہے۔ فائنل ٹرمز سر پر ہیں۔ ویسے ہی آپ کی بیماری کے دوران میں بچوں پر بالکل توجہ نہ دے پائی۔ ٹیوٹر تو اپنے گھنٹے مکمل کر کے کھسک لیتا ہے اسے اس بات سے غرض نہیں کہ کسی بچے کی پوزیشن بن رہی ہے یا نہیں۔ یہ دیکھنا میرا ہی کام ہے۔ مجھے تو اب رات دن لگ کر۔''

''پلیز گیتی...... پلیز! کیپ کوائٹ ناؤ۔'' میں نے آنکھیں موند کر کہا۔

میرے اندر ایک دم ہی کچھ سلگ اٹھا تھا۔ وہ حیرانی سے میری طرف دیکھتی رہ گئی۔

✿......✿......✿

کچھ دن بعد میں لاہور چلا آیا۔ ساحرہ نے میرا استقبال چمکتے چہرے کے ساتھ کیا تھا۔

''مجھے یقین تھا۔ آپ ضرور آئیں گے۔''

''کیوں؟ میں کچھ چھوڑ کر تو نہیں گیا تھا۔'' میں مسکرایا۔

''اور جو ہم ثبوت پیش کریں۔'' وہی انداز دلربائی...... جو جکڑ لیتا تھا۔

''کہاں؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

وہ اٹھ کر الماری تک گئی اور ایک رومال نکال لائی۔ پھر میرے سامنے بیٹھ کر اس رومال کی تہیں کھولیں۔

اندر سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا' دو استعمال شدہ ٹشو پیپرز اور ایک لائٹر موجود تھا۔

''کم آن۔'' بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔ ''یہ کیا حماقت ہے۔''

''بیرسٹر صاحب!'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''یہ محبت ہے۔''

''محبت؟'' میں استہزائیہ ہنسا۔ ''تمہیں شاید کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ساحرہ''

''نہیں...... میں آپ کی نہیں اپنی بات کر رہی ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''آپ بڑے آدمی ہیں...... دو جمع دو چار پر یقین رکھتے ہوں گے...... میں پہلی نظر کی محبت کی قائل نہ تھی' اب ہو گئی ہوں۔ اس میں کوئی جھوٹ' کوئی کھوٹ نہیں۔ میں اتنے دنوں سے نہایت بے چینی سے آپ کی منتظر تھی۔ میں حقیقتاً آپ سے......''

✿......✿......✿

میں حقیقتاً ساحرہ کے ساتھ لانگ ڈرائیو پہ نکل گیا۔ کراچی سے لاہور اور لاہور سے کراچی کا سفر میرا معمول بن گیا۔ گیتی کو میرے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احساس ہوا تھا یا نہیں' میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ ایک پرسکون سمندر کی مانند تھی' مجھے اس کے اندر موجزن جذبوں کا علم اکثر نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی گیتی میرے لئے سانس لینے کے عمل کا نام تھی۔ از حد ضروری اور نہایت غیر محسوس ساحرہ میری نیند' میرا نشہ بن گئی۔ تھکن جسم وجاں کو چڑھتی تو مجھے ساحرہ کی کمی محسوس ہونے لگتی۔ میں لاہور پہنچ جاتا اور نہایت فریش ہو کر واپس لوٹتا۔ واپس آ کر گیتی مجھے اچھی لگتی۔ بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنا دلچسپ محسوس ہوتا۔

باقر کے بتائے ہوئے فارمولے نے زندگی کو واقعی خوشگوار بنا دیا تھا۔

دس سال پورے دس سال ساحرہ کے سحر میں مبتلا ہو کر یوں گزرے کہ مجھے' بیرسٹر بختیار احمد کو مڑ کر سود وزیاں کے حساب کتاب کا ایک مرتبہ بھی خیال نہ آیا۔

ساحرہ نے حقیقتاً مجھے بہت محبت دی۔ اس نے مجھے روح تک شانت کر دیا۔ میں نے اسے روپیہ دیا۔ اپنا قیمتی وقت دیا۔ ہمارا حساب برابر چل رہا تھا جب اس نے مجھ سے بہت بڑی فرمائش کر دی۔

''بختیار!...... مجھ سے شادی کر لیں۔''

''واٹ نان سینس ساحرہ!'' میں اس کی فرمائش پر بے ساختہ ہنس دیا۔ ''یہ تمہارے اور میرے بیچ شادی جیسا فارمولا موضوع کس لئے۔''

''بختیار! میں سنجیدہ ہوں۔'' وہ واقعتاً سنجیدہ تھی۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ آپ سے پہلے میری زندگی میں کئی مرد آئے۔ آئے اور چلے گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح۔ اپنا ہر نقش خود ہی مٹا گئے۔ آپ مجھے سب سے ہٹ کر لگے۔ سب سے مختلف...... میں نے اپنا دل' جسم اور سوچیں سب کچھ آپ کو دان کر دیا۔ میں اپنی روح کی سچائی سے آپ کی بن گئی۔ جی ہی جی میں آپ کی پوجا کی ہے میں نے...... لیکن' لیکن اب من کرتا ہے بختیار! کہ آپ دیوتا نہیں انسان بن کر یوں ملیں کہ من وتو کا فرق مٹ جائے اور یہ خصوصیت محض ایک ہی رشتے کو حاصل ہے۔''

''محبت کا رشتہ ہر رشتے سے زیادہ معتبر ہے ساحرہ بیگم! میں ذرا سا تلخ ہوا۔'' اس میں کسی گارنٹی کی ضرورت نہیں اور پھر میں نے تم سے کبھی نہیں کہا میں کبھی تم سے شادی بھی کروں گا۔''

''مجھے اعتراف ہے بختیار!'' اس کی نظریں جھک گئیں۔ ''لیکن آپ کو بھی تسلیم کرنا ہوگا میں ایک طوائف ہو کر بھی کبھی آپ سے طوائف بن کر نہیں ملی۔ آپ کے لئے طوائف سے پھر عورت بن گئی۔ اب میں عورت سے بیوی بننا چاہتی ہوں۔ کیا میری دس سال کی ریاضت کا اتنا سا صلہ بھی آپ کے پاس نہیں۔ محض نکاح کے تین بول؟''

''کیا ان دس سالوں میں میں نے تمہیں کچھ نہیں دیا ساحرہ؟''

''وہ سب کچھ جس کی مجھے تمنا نہ تھی۔'' وہ گہرے دکھ سے بولی۔ ''دولت' بنگلہ' گاڑی...... ان سب چیزوں کی تمنا آپ سے مل کر ختم ہو گئی تھی۔''

''ربش...... ختم کرو!'' میں جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔

''بختیار!'' وہ تیزی سے میرے سامنے آ گئی۔ ''میں آئندہ محض بیوی کی حیثیت سے آپ سے ملنا چاہوں گی۔''

''میں سوچوں گا۔''

میں کہہ کر وہاں رکا نہیں۔ تیزی سے نکل آیا۔

میں گھر میں داخل ہوا تو سفیان کہیں جا رہا تھا۔

''السلام وعلیکم پاپا۔ ہاؤ آر یو۔'' وہ اپنی ''سٹی'' کی چابی جھلاتا خاصی تیزی میں تھا۔

''وعلیکم السلام۔ کہاں جا رہے ہو برخوردار!''

میں کوئی ہفتہ بھر بعد اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کا یوں تیزی سے جانا مجھے پسند نہ آیا۔

''پاپا وہ...... ''وہ ذرا کی ذرا رکا'' ایک دوست سے ملنا ہے۔ میں ویسے بھی لیٹ ہو گیا ہوں۔''

''اوکے گوا'' میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اندر چلا آیا۔

اندر ارما اور ایمان کی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ غالباً کوئی ون ڈش ٹائپ تقریب تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں ذرا سا جھانک کر اوپر کمرے میں چلا آیا۔

منورہ میرے پیچھے آئی تھی۔

''صاحب جی! کھانا لاؤں؟''

''ہوں؟'' میں کسی خیال میں چونکا۔ ''گیتی کہاں ہے؟''

''بی بی جی...... شاید مارکیٹ گئیں ہیں...... کچھ بتا کر نہیں گئیں۔''

''میں ان کے ساتھ ہی ڈنر کروں گا۔''

''جی بہتر!'' وہ چلی گئی۔

میں لباس تبدیل کر کے بیڈ پر چلا آیا۔ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کر میں بزنس سے متعلق میگزینز دیکھنے لگا۔

میرے ذہن میں ساحرہ کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ ذہنی طور پر میں غیر حاضر تھا۔

کتنی عجیب سی فرمائش کی تھی اس نے' میں بیرسٹر بختیار احمد جو اتنے سالوں کی محنت کے بعد اب اس کا پھل پانے والا تھا' اس مقام پر آ کر دوسری شادی کرتا اور وہ بھی ایک طوائف زادی سے؟ اور پھر مجھے بیوی کی ضرورت ہی کہاں تھی؟ گیتی جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے کوئی پاگل ہی دوسری شادی کے متعلق سوچ سکتا تھا۔ میرا گھر تھا' بیوی تھی' چار بچے تھے۔ جو جوانی کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ میں دوسری شادی کیوں کرتا؟

مجھے ساحرہ کی باتوں اور اس کے تصور سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی کا یہ باب اب بند ہونا چاہیے۔

چند ہی لمحوں میں میں اس کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ ''ہیلو ساحرہ! بختیار بات کر رہا ہوں۔''

''کہیے!'' اس کا لہجہ کمزور تھا۔''

''میں نے فیصلہ کیا ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے شادی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''بختیار......'' اس کی آواز دکھ سے بوجھل ہو گئی۔ ''میں نے محض ایک کاغذ ہی مانگا ہے۔''

''میں وہ کاغذ تمہیں نہیں دے سکتا ساحرہ۔'' میرا لہجہ حتمی تھا۔ ''میں نے تمہیں اپنی زندگی کے دس سال دیئے ہیں۔ بے حساب پیسہ دیا ہے۔ اپنی جیون ساتھی کا اعتماد اور اعتبار دیا ہے۔ تمہیں...... آج تمہیں شادی کی خواہش ہے' کل کو تم بچے مانگو گی' پھر تمہیں اس کے حقوق کا خیال ستائے گا...... تمنا کی کوئی حد نہیں ہوتی ساحرہ...... میں بہرحال اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ میری بیوی بہترین ہے' میرے وارث جوان ہو چکے ہیں...... اور میرا خیال ہے میں تمہیں تمہارے حصے کا وقت دے چکا ہوں...... تم آئندہ مجھ سے محض بیوی کی حیثیت سے ملنا چاہتی تھیں...... میرا خیال ہے' ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے......''

میں نے دوسری جانب اس کی سسکیاں سنیں۔

''خدا حافظ!''

میں ریسیور رکھ کر مڑا اور پتھر کا بن گیا۔ گیتی میرے عین مقابل تھی۔

''گیتی......!'' میرے لبوں سے اعتراف گناہ' کی مانند نکلا تھا۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

''آ کر کھانا کھا لیجئے!'' وہ کہہ کر مڑ گئی تھی۔

✿ ✿ ✿

ایک طویل عرصے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس روز گیتی کو دیکھ کر پتھر کا میں نہیں بنا تھا۔ وہ سب باتیں اپنے کانوں سے سن لینے کے بعد گیتی پتھر کی ہو گئی تھی۔

میں اعلیٰ پائے کا قانون دان ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی اس پتھر کے مجسمے میں پھر کبھی روح نہ پھونک سکا۔

اس نے مجھ سے کوئی استفسار نہ کیا تھا۔ گلے شکوے کرنا اس کو کبھی نہ آیا تھا۔ لڑائی جھگڑا اس کی فطرت نہ تھی۔ ایسے میں غم میں اس کا پتھر بن جانا لازمی امر تھا۔

زندگی گزرتی چلی گئی۔ مجھے پھر کبھی گیتی' بیوی کے روپ میں نہ ملی۔ وہ صرف میرے بچوں کی ماں تھی۔ میرے گھر کی مالکن تھی۔ وہ میری گیتی نہ تھی۔

سفیان اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلا گیا۔ فرقان دوسرے شہر ہاسٹل شفٹ ہو گیا۔

ارما اور ایمان کی شادی ہم نے ایک ساتھ ہی طے کر دی تھی۔ یوں بھی ہمیں بہتر لگا تھا کہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں چلی جائیں۔ زندگی بھر ایک دوسرے کی مونس و غم خوار رہیں۔ ہماری بیٹیاں بیاہ کر چلی گئیں۔ گھر خالی ہو گیا۔ دل خالی ہو گیا۔

گیتی کے جذبات کیا تھے۔ مجھے علم نہ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کرنے کو اب زندگی میں کچھ باقی نہیں۔

خالی دل' خالی کمرے اور خالی گھر نے مجھے کسی ناگ کی مانند ڈسا تھا میں دیوانوں کی طرح گیتی کو ڈھونڈھتا پھرنے لگا۔

ایک کمرے سے دوسرا کمرہ...... ٹیرس' سیڑھیاں' کچن' لاؤنج' ڈرائنگ' ڈائننگ۔ سب جگہ ڈھونڈا وہ کہیں نہ تھی۔

پھر میں باہر نکل آیا۔ سفید لباس میں ملبوس' افسردہ گیتی لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اس کی مانند اداس زرد چاند سرو کے اوپر ٹکا ہوا تھا۔ میں ایک ایک سیڑھی اترتا اس کے پاس جا بیٹھا۔

''گیتی۔ یوں اکیلی بیٹھی ہو؟''

اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

''میں ایک طویل عرصے سے اکیلی ہوں بیرسٹر صاحب......'' پھر وہ موسم کی مانند سرد اور خشک لہجے میں بولی۔ ''یہ آپ کو آج کیسے خیال آیا؟''

''کیا عورت کی لغت میں معافی کا لفظ نہیں ہوتا گیتی آرا؟'' میرے لبوں پر شکوہ سسک پڑا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

''مرد کی لغت میں ''وفا'' کا لفظ ہوتا ہے؟''

''میں نے کبھی تم سے بے وفائی تو نہیں کی گیتی......! تمہیں تمہارے مقام سے کبھی نیچے نہیں کیا' کسی دوسری عورت کو تمہارا مقام نہیں دیا...... میں نے تو...... تھوڑا سا وقت ڈھونڈا تھا اپنے لئے' تم بہت مصروف تھیں...... بیوی کو اپنے اندر کہیں سلا کر تم محض ماں بن گئی

تھیں۔ قصوروار صرف میں ہی نہیں ہوں گیتی......! تم نے خود اپنے اور میرے بیچ اتنی ذمہ داریوں کو حائل کر لیا کہ تم مجھے ایک خواب کی مانند تکنے لگیں...... اور بس...... ذرا سی دیر کو میری آنکھ لگ گئی تم ماں بن کر شوہر کو بھول گئیں...... تم نے فراموش کر دیا گیتی کہ مرد وہ بچہ ہوتا ہے جسے روز ایک نیا کھلونا دے کر بہلانا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ بچہ روٹھ کر گلی میں جا کھڑا ہوتا ہے اور جو دروازہ کھلا مل جائے وہیں جا نکلتا ہے۔ بس اتنی سی غلطی ہے گیتی......! حالانکہ مڑ کر واپس اپنے گھر ہی آنا ہوتا ہے...... گھر کا دروازہ کھلا ہونا چاہیے نا؟''

وہ خاموش بیٹھی چاند کو تکتی رہی۔ پھر بولی۔

''بختیار! عورت کی خواہشات مرد سے مختلف نہیں ہوتیں۔ مرد توجہ چاہتا ہے' ہر پل محبت مانگتا ہے' مکمل حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔ عورت کو بھی توجہ درکار ہوتی ہے...... پل پل اپنے شوہر کی محبت اس کا دل بھی مانگتا ہے...... لیکن یوں ہے بختیار کہ اس کے خمیر میں خدا نے قربانی کا وہ عظیم جذبہ بھی گوندھ دیا ہے جو مرد کے خمیر میں نہیں...... یہ ممتا کا جذبہ ہے' ابتداء سے انتہا تک صرف قربانی۔ اپنے سکھ کی قربانی' اپنی نیند کی قربانی' اپنے جذبات کی' خواہشات کی قربانی۔

قربانی کا یہ تصور مرد کے پاس نہیں ہے۔

بختیار! شوہر' بیوی کے طاق نسیاں میں رکھا کوئی ان جلا چراغ تو نہیں جسے ماں بن کر بھول جائے...... شوہر تو عورت کا وہ قیمتی زیور ہے جسے وہ حفاظت سے لاکر میں رکھ بھی دے تو بھولتی نہیں۔ ہر روز' صبح و شام' اٹھتے بیٹھتے اسے اپنے زادِ راہ' متاعِ حیات کا خیال رہتا ہے۔ تحفظ کے اس عظیم احساس کو کوئی عورت کیسے فراموش کر سکتی ہے؟

اپنی اولاد کی پرورش کی خاطر اگر عورت اپنے جیون ساتھی کو مکمل توجہ نہ دے پائے تو کیا اس کے لئے جیون ساتھی کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے؟

میرے بچے۔ کیا تمہارے بچے نہ تھے؟ ان کی خاطر جدوجہد کے لئے کیا تم مجھ سے دور نہیں ہوئے؟ کیا میں نے تمہاری بے توجہی محسوس کر کے کسی ساحرہ کی کمی کو محسوس کیا؟ کیا مجھے تمہاری محبت' تمہاری توجہ' تمہارے جذبوں اور ان کے اقرار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی؟ بارہا ہوتی تھی بختیار......! بارہا لیکن میں نے زندگی میں کبھی کسی چور رستے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیونکہ میں ایک ماں تھی ماں! ممتا کا سچا نشہ عورت کو اتنا بے نیاز رکھتا ہے اسے خود فراموشی کے جھوٹے سہاروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

لیکن شاید ...... شاید بختیار! ایک باپ کی محبت میں وہ طاقت نہیں جو ایک مرد کو بے نیازی' خود فراموشی سکھا سکے۔

مرد کبھی خود کو فراموش نہیں کر پاتا کبھی نہیں' اس کے اندر چھپا انا کا ناگ بار بار اپنا پھن پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ ہاں میں ہوں! ...... میں ہوں! میں ہوں!

اور پھر ممتا میں ڈوبی عورت کو چھوڑ کر مرد بھاگتے ہیں کسی ساحرہ کے پاس' کسی حسن آرا کے پاس' کسی مہ پارہ کے پاس۔

بھاگتے جاتے ہیں اور پلٹ پلٹ کر اپنا دروازہ دیکھتے جاتے ہیں۔

"لیکن بختیار! ایک بات غور سے سنو گھر کا دروازہ مرد کو ہمیشہ کھلا ملتا ہے۔ لیکن دل کا دروازہ ایک بار بند ہو جائے تو پھر کبھی نہیں کھلتا کبھی نہیں۔"

اس کی آواز آنسوؤں کی نمی سے رندھنے لگی۔

"میرے دل کا دروازہ بھی عرصہ ہوا بند ہو چکا ہے۔ گھر آج بھی تمہارا ہے بختیار!۔ بچے تمہارے ہیں ...... شاید یہ وجود بھی تمہارا ہے۔ بس ایک دل کی کمی ہو گئی ہے ایک دل کی۔"

وہ اٹھی اور تھکے تھکے قدموں سے اندر چلی گئی۔

"دل ہی تو چاہئے گیتی ...... دل ہی تو چاہئے۔ مرد کی حقیقت کو اتنا سمجھتی ہو پھر بھی یہ نہ جان پائیں کہ عمر کی آخری منزل پر آ کر مرد کو ایک بار پھر صرف اپنی عورت کا دل درکار ہوتا ہے۔ اسے گھر کا نہیں دل کا دروازہ کھلا چاہئے ہوتا ہے۔"

میں زندگی کا سب سے اہم مقدمہ ہار کر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے رو رہا تھا۔

رہا تھا۔ سوتیا کی منہ بند کلی۔ میاں کو جگانے کمرے میں گھسی تو سامنے ہی سنگھار میز کے آئینے نے میرا استقبال کیا اور منہ چڑا کر ہنسنے لگا۔ میں میاں کو جگانے کے بجائے آئینے کے نزدیک چلی آئی۔ بال یوں ہو رہے تھے جیسے ابھی ابھی بہت سی چڑیاں آپس میں لڑ کر ان میں سے نکل بھاگی ہوں۔ کم خوابی نے پچھلے دن کی تکان کو اب تک چہرے پر سجایا ہوا تھا۔ تھکی تھکی پژمردہ آنکھیں' کملایا مرجھایا' چہرہ دو دن سے پہنا ہوا لباس اب اتنا گندہ معلوم ہو رہا تھا کہ مجھے خود سے شرمندگی ہونے لگی۔

میں لاشعوری طور پر کنگھا اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگی۔ میاں نے کروٹ لے کر پہلے گھڑی کو اور پھر مجھے گھورا۔

''دس منٹ پہلے اٹھنا تھا...... اور تم مجھے جگانے کی بجائے کھڑی سنگھار کر رہی ہو۔'' وہ تلخی سے کہتے ہوئے تولیہ اٹھا کر باتھ روم کی جانب چلے گئے۔

ببلو اٹھ کر رونے لگا۔ میں نے اسے دودھ لا کر دیا اور صائمہ اور اسد کو جگا کر تیار ہونے کو کہا اور خود ناشتہ بنانے باورچی خانے میں چلی آئی۔

میرا دھیان بسمہ میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے سلائس توے پر سے ادھ جلی حالت میں اتارے چائے آدھی چولہے میں گرائی' آدھی کیتلی میں ڈالی۔ انڈوں کی زردیاں فرائنگ پین میں گرتے ہی ٹوٹ گئیں حالانکہ میاں کو ٹوٹی ہوئی زردی دیکھتے ہی انڈے اور مجھ سے نفرت محسوس ہونے لگتی تھی۔

اس روز میں نے دو تین مرتبہ میاں سے جھاڑ کھائی اور دو تین مرتبہ جھاڑ کر بچوں کو اسکول روانہ کیا۔ ببلو کو تھپڑ مار کر دوبارہ سلایا اور گھر کے کاموں میں لگ گئی لیکن میرے دھیان کی سوئی بسمہ کی ریکارڈ پر ہی اٹکی رہی۔ میں نے جیسے تیسے کام نمٹایا پھر ہاجرہ کے پاس چلی آئی۔ ہاجرہ میری پڑوسن تھی اور اس کے اور ہمارے گھر کی ایک دیوار مشترکہ تھی۔

ہاجرہ کو دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون حاصل ہوا۔ وہ بھی میرے جیسے بدرنگ کپڑے پہنے بالوں کا ایک ٹکوتا سا جوڑا بنائے برآمدے میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ سلام دعا کر کے میں بھی اس کے برابر بیٹھ کر پالک کے ڈنٹھل توڑنے لگی۔ ببلو اس کے چھوٹے منے کے پاس جا بیٹھ گیا۔

''ہاجرہ! یہ دینو کاکا کے گھر میں کون آیا ہے؟'' میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''نیا شادی شدہ جوڑا ہے۔'' اسے میری توقع کے مطابق آگاہی تھی۔ ''آدمی کسی سرکاری محکمے میں کلرک ہے۔ منیر تو جانتے ہیں اسے' کہہ رہے تھے بڑا اچھا لڑکا ہے۔''

''لڑکی کو دیکھا ہے تم نے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں' ارے بڑی چاندی لڑکی ہے' بسمہ نام ہے۔''

''اچھا اچھا...'' میں نے سر ہلایا اور پر خیال لہجے میں نام دہرایا۔

''میں تو پرسوں ہی مل آئی تھی۔ بڑے اخلاق والی ہے۔ تم نے نہیں دیکھا اسے؟''

اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''آج دیکھا ہے۔'' میرے اندر حسرتیں بیدار ہونے لگیں۔

''مل آنا تھا نا۔ نئے پڑوسی ہیں۔''

''ابھی جاتی ہوں۔'' میں چپکے سے بولی۔

لیکن ہاجرہ کے گھر سے نکل کر بسمہ کے گھر میں گھسنے کی میری ہمت نہ ہوئی۔ میں سیدھی اپنے گھر چلی آئی۔ اس کا وہ اجلا اجلا سا روپ اور میرا حلیہ ایسا جیسے گرم پانی میں ابلنے سے کسی کپڑے کا سارا رنگ نکل گیا ہو۔ تھکا ہوا' پژمردہ' بے رنگ وجود......

شام کو سب کاموں سے فراغت پا کر میں خوب نہائی۔ پھر اپنا ایک قدرے نیا جوڑا پہن کر' ہلکا پھلکا سا میک اپ کر کے میں نے میاں کو پڑوس جانے کا بتایا اور ببلو کو لے کر بسمہ کے گھر چلی آئی۔ دروازہ اس کے شوہر نے کھولا تھا' وہ ایک خوش شکل' قدرے بے فکر سا نوجوان تھا۔ ہاتھ میں ایک میلا سا تولیہ تھامے غالباً وہ اپنی موٹر سائیکل کی صفائی میں مصروف تھا۔ مجھے سلام کر کے اس نے بسمہ کو آواز لگائی۔

''بسمہ! دیکھو کوئی باجی آئی ہیں۔'' وہ اندر سے نکل کر آئی۔ اس نے کپڑے بدل لیئے تھے۔ شاید میری طرح وہ بھی نہا کر نکلی تھی۔ اب اس نے پھولدار' سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ چارجٹ کا سیاہ دوپٹہ گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں کے بالے تھے۔

میں تھوڑی دیر کے لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔ مجھ سے کچھ بولا نہ گیا۔ وہ اتنی پرکشش' اس قدر خوب صورت لگ رہی تھی کہ میں گنگ ہو گئی۔

''السلام علیکم باجی!'' اس نے آگے بڑھ کر بڑے اشتیاق سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"وعلیکم السلام میرا نام زہرہ ہے۔" میں کچھ بولنے کے قابل ہوئی۔

"جی میں جانتی ہوں۔ آپ سامنے تو رہتی ہیں۔ ہاجرہ باجی نے آپ کا بتایا تھا مجھے۔ آئیں نا باجی اندر آجائیں۔"

وہ مجھے لے کر اندر کمرے میں چلی آئی۔ ہبلو اس کے شوہر کے پاس بیٹھ کر موٹر سائیکل کی صفائی ہوتے دیکھنے لگا۔

"بیٹھیں باجی!" وہ صوفے کی جانب اشارہ کر کے خود نواری پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ہمارا گھر جس لین میں تھا اس میں سارے گھر تین کمروں والے تھے لیکن دینو کا کا کے کوارٹر کی لین کے سارے گھر محض ایک کمرے ایک چھوٹے برآمدے اور صحن پر مشتمل تھے۔ مگر میں دل ہی دل میں یہ اعتراف کئے بنا نہ رہ سکی کہ بسمہ نے اپنے چھوٹے سے گھر کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔

کمرے میں نواری پلنگ اور صوفہ پڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی میز پر رکھے گلدان میں تازہ پھول سجے تھے' جن کی مہک سے کمرہ بھرا ہوا تھا اور ماحول میں عجب دل فریبی سی رچی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر بسمہ اور اس کے میاں کی تصویر لگی تھی۔ کھڑکیوں پر بڑے اچھے پردے لگے ہوئے تھے' جن کے رنگ دیوار کے رنگ سے بڑا بھلا امتزاج پیدا کر رہے تھے۔ پردوں کے خوب صورت ڈیزائن کی وجہ سے وہ کمرا بڑا بڑا اور کشادہ محسوس ہوتا تھا۔ بستر پر بالکل صاف ستھری' بے داغ' اجلی چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں جس صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی وہاں سے باہر برآمدے میں رکھا شوکیس صاف نظر آ رہا تھا۔ اس میں بسمہ نے اپنے برتن سلیقے سے لگائے ہوئے تھے۔

"باجی چائے لیں گی یا ٹھنڈا منگواؤں؟" اس کی کھنکتی آواز نے میرا دھیان اپنی جانب کیا۔

"نہیں' نہیں کوئی تکلف نہیں...... میں تو بس تم سے ملنے آئی تھی اور سچ پوچھو تو تمہیں قریب سے دیکھنے آئی تھی کہ کیسی لگتی ہو۔ صبح تمہیں دور سے دیکھا تھا نا' میرا دھیان سارا دن تم میں اٹکا رہا۔ اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ میں تم سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ لیکن بسمہ! قریب سے تم اور بھی پیاری لگتی ہو۔" میں دل کھول کر اعتراف کئے بنا نہ رہ سکی

تھی۔ بسمہ میری باتوں کے جواب میں کچھ نہ بولی۔ بس سر جھکا کر مسکرا دی تھی۔ "کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہاری شادی کو؟" میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"چھ مہینے!" وہ زیر لب مسکرائی۔

"اچھا...... میں ہنس دی۔ "تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے۔ بسمہ! جیسے ابھی کل پرسوں تمہاری شادی ہوئی ہو۔"

بسمہ بھی شرمیلی ہنسی ہنس دی۔

"اصل میں باجی...... یہ! ہیں نا! انہیں میرا سج سنور کر رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ مجھے بتانے لگی۔

"یہ کہتے ہیں' صبح میرے اٹھنے سے پہلے ہی کپڑے بدل کر تیار ہو جایا کرو۔ میں سو کر اٹھوں تو تم بالکل سجی بنی نظر آؤ اور شام کو میں گھر لوٹوں تو صبح سے زیادہ تیار ملو۔ انہیں میرا گندا مندا رہنا بالکل پسند نہیں۔ اتنا غصہ کرتے ہیں باجی کہ میں ڈر جاتی ہوں۔ اس لئے صبح اٹھتے ہی پہلے نہاتی ہوں تیار ہوتی ہوں' پھر نماز پڑھ کر انہیں جگاتی ہوں اور شام کو بھی ان کے آنے سے پہلے ہی لباس تبدیل کر لیتی ہوں۔ یہ کہتے ہیں ہر وقت کلائیاں چوڑیوں سے بھری رہیں۔ روزانہ گجرے اور گلدستہ لے کر آتے ہیں۔ پھول انہیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ کبھی کلائیوں کے گجرے لاتے ہیں' کبھی بالوں کے لئے' کبھی کانوں میں پہننے کو...... پھولوں سے بڑی محبت ہے جی انہیں۔"

"تم خود بھی تو ایک پھول ہو بسمہ!" میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "نرم و نازک شگفتہ تر و تازہ!" اپنی تعریف سن کر اس کے گال سرخ ہو گئے۔ اس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

درحقیقت مجھے پہلی ہی نظر میں اس پھولوں جیسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ اور اس سے ملنے کے بعد میں اور بھی اس کی گرویدہ ہو گئی۔ اس کی سادگی اور فطری معصومیت نے مجھے اپنا اسیر کر لیا تھا۔ وہ ایک ایسی کہانی کی مانند تھی جس پر نگاہ پڑتے ہی ہر عورت اپنی زندگی کی کتاب کے ان اوراق کو پھر پلٹنے پر مجبور ہو جائے جہاں رنگوں' تتلیوں' جگنوؤں' خوشبوؤں اور پھولوں کی باتیں درج ہوتی ہیں۔ وہ چند اوراق جو پھر آگے آنے والی ذمہ داریوں کے بھاری ابواب تلے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر کبھی نہ کھلنے کے لئے۔

اس سے مل کر مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں نے کسی دکان پر برسوں بعد اس

پرفیوم کی مہک سونگھی ہو جو میں اپنے اوائل شباب میں استعمال کرتی تھی اور اس مہک نے مجھے کئی برس پیچھے پہنچا دیا ہو۔ وہ مہک جو چند لمحوں کے لئے ہی سہی آپ کے دل کو اس انداز میں دھڑکا دیتی ہے جیسے وہ برسوں پہلے دھڑکتا تھا۔

بسمہ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں ہر دوسرے دن ان کے گھر آنے جانے لگی۔ وہ بھی میری بہت عزت کرتی تھی۔ اس کا شوہر رشید بھی بھلا مانس تھا' میرا بڑا خیال کرتا تھا۔ میرے جاتے ہی بھاگم بھاگ گرم گرم سموسے اور کچوریاں لے آتا' کبھی ٹھنڈی بوتلیں لاتا اور کبھی تازہ تازہ جلیبیاں۔ ہمارے محلے میں ان کے آنے سے بڑی رونق ہو گئی تھی ورنہ تو وہی چند ایک چہرے تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں دکھ گئی تھیں اور وہی بدمزہ' دل جلی باتیں تھیں جن سے دل اکتائے ہوئے تھے۔

محلے بھر کی زندگی سے بیزار' روٹین لائف سے تھکی' پژمردہ عورتوں کے لئے بسمہ جیسے گرما گرم چائے کا کپ ثابت ہوئی تھی۔ سب میں تازگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے سب کو جوانی کے اولین دور کی یاد دلا دی تھی۔ بسمہ ہمارے محلے کے لئے جیسے صفائی کی نئی مہم کا نام تھا۔ وہی خواتین جو ہفتے بھر پہلے پہنے ہوئے کپڑوں میں ملبوس بلاتکلف سب کی مزاج پرسی کرتی پھرتی تھیں اب گھر سے باہر جھانکنے سے پہلے ایک بار آئینے پر ضرور نگاہ دوڑا لیا کرتی تھیں۔

میں کبھی ہاجرہ کو آواز لگا کر کوئی چیز مانگا کرتی تھی تو وہ فوراً ہی چیز دینے کے بہانے میرے گھر آن دھمکتی تھی اور کبھی بھی اپنے حلیے کی پروانہ کرتی تھی۔ خواہ اس کے سر میں مہندی تھپی ہوئی ہوتی یا کپڑے دھونے کے دوران شلوار ٹخنوں سے اونچی اڑسی ہوتی۔ لیکن اب میرے کچھ مانگنے پر ہاجرہ وہ چیز بچوں کے ہاتھ بھجوا دیتی تھی اور ساتھ پیغام بھی۔

''امی کہہ رہی ہیں انہوں نے بالوں میں تیل ڈالا ہوا ہے' وہ نہا کر آئیں گی۔''

خود میرا اپنا بھی یہی عالم تھا۔ میں بی اے پاس تھی۔ محلے کی دوسری میٹرک اور انٹر پاس عورتوں سے خود کو شروع سے برتر جانتی تھی۔ شادی سے پہلے اپنا بے حد خیال رکھتی تھی۔ انگ انگ پر توجہ دینے اور سجانے سنوارنے کا شوق تھا لیکن عورت کے لئے تو شادی خود فراموشی کی ایک ایسی دلدل ثابت ہوتی ہے جس میں سے نکلنے کے لئے ہمیشہ کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بسمہ اس خود فراموشی کی دلدل سے نکلنے کا سہارا تھی۔ میں نے چونک کر خود پر نگاہ

ڈالی تھی۔ بوکھلا کر آہٹوں میں خود کو کھو جاتا تھا۔ سہم سہم کر سوچ تھا۔ ''کیا یہ واقعی میں ہوں؟'' ایک اچھی خاصی خوش شکل لڑکی پندرہ سال کے عرصے میں ایک بدشکل' بدرنگی عورت میں کس طرح تبدیل ہوئی تھی۔ مجھے سراغ نہ مل سکا۔

پورے گھر کا کام اور بھاگ دوڑ بھی جسم کو سنبھالنے میں ناکام رہے تھے۔ فربہی مائل جسم عمر کے پختہ کار ہونے کی تصدیق کرتا تھا۔ بال جو کبھی بڑے سلکی' چمکدار ہوا کرتے تھے اب کسی مریل مرگھلی بلی کی دم جیسی چٹیا میں مقید بے چارے سے کندھے پر پڑے رہتے تھے۔ میری جلد بھی کبھی بہت اچھی ہوا کرتی تھی لیکن اب جا بجا چھائیاں اور مہاسوں کے کھلے منہ صاف دکھائی دیتے تھے۔

بسمہ کی شگفتگی اور دلکشی نے مجھ پر اپنا جادو چلایا تھا۔ میں نے وہ سب ٹوٹکے ذہن میں تازہ کئے تھے جو میں کبھی خود کو شگفتہ اور دلکش رکھنے کے لئے کیا کرتی تھی۔

صاحب اور بچوں کے کاموں کو میں نے وقت کے ایک خاص دائرے میں قید کیا ورنہ اس سے پیشتر تو دن رات کے چوبیس گھنٹے ان ہی کی چاکری میں صرف ہوتے تھے۔ لیکن اب وقت کا وہ دائرہ پورا ہونے سے قبل ہی میں کوشش کر کے ان سب کے تمام کام نمٹا دیا کرتی۔ اب بقیہ وقت میں خود کو دینے لگی۔ میں' جو تین چار دن بعد غسل خانے میں گھسنے کا وقت' بمشکل نکالتی تھی' روز نہانے لگی۔ نہانے سے قبل بالوں کو اکثر دہی اور انڈہ بھی لگا لیا کرتی۔ چہرے کو کھیرا مل کر صاف کر لیتی۔

رات سونے سے قبل خواہ کتنی ہی دیر ہو جاتی میں اپنے لئے ایک جوڑا ضرور ہی استری کر کے رکھ لیتی تھی۔ کیونکہ دن میں مجھے اپنے کپڑے استری کرنے کا وقت ملتا ہی نہیں تھا۔ بغیر استری کے کپڑے پہن لیا کرتی تھی لیکن بسمہ کو ڈرائی کلین ہوا دیکھ کر میں ہی نہیں محلے کی تقریباً تمام عورتیں استری شدہ لباس پہننے لگی تھیں۔

لباس استری کر کے رکھ لیتی تو جلد کی کلینزنگ کا خیال آ جاتا۔ ملائی میں ذرا سا لیموں نچوڑ کر میں صحن میں آ بیٹھی اور تقریباً آدھا گھنٹہ خوب خوب جلد پر ملتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے بسمہ کا کھلا کھلا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔

ایک روز میں اس کے گھر گئی تو پتہ چلا رشید آفس نہیں گیا تھا۔ اس کی طبیعت

خراب تھی۔ الٹی اور دست لگے ہوئے تھے۔ عصر کا وقت تھا اور رشید صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹا تھا۔ بسمہ اس کے قریب بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر رشید اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟'' میں نے اس کی بڑھی ہوئی شیو اور ملگجے لباس کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ دونوں تھے بھی تو اس قدر نفاست پسند کہ ذرا سی اونچ نیچ سے فرق پڑتا تھا۔

''کیا بتاؤں باجی! برا حال ہے۔ اتنی الٹیاں ہو رہی کہ اندر سے آنتیں اکڑ گئی ہیں۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''پھر دستوں نے پیٹ کو کمر سے لگا دیا ہے۔ دو دن میں ایسا لگ رہا ہے کہ دو سالوں سے بیمار ہوں۔''

''کوئی دوائی وغیرہ نہیں لی؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''لی ہے مگر فرق نہیں پڑا۔ ابھی پھر ڈاکٹر کے ہاں سے آ رہا ہوں۔ اس نے دوائی بدل دی ہے۔''

''خدا تمہیں شفا دے!'' میں تردد سے بولی۔

وہ چند ایک باتیں کر کے اندر کمرے میں چلا گیا' تب میں نے بسمہ کو دیکھا۔ وہ حسب معمول اور حسب عادت صاف ستھری' سجی بنی تھی۔ آسمانی کپڑے اور آسمانی رنگ کی چوڑیاں۔ ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک کانوں میں موتیے کی کلیاں۔

میں جی ہی جی میں اس کے معصوم حسن کو سراہنے لگی۔

''کچھ بولیں باجی! کچھ بات کریں۔'' وہ اداسی سے بولی تھی۔ میں نے قدرے چونک کر اسے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور لہجہ بھی بھیگا بھیگا سا تھا۔

''روئی روئی سی لگتی ہو بسمہ!'' میں پوچھ بیٹھی۔

''بس باجی......'' وہ انگلی سے بستر پر لائنیں بنانے لگی۔ ''ان کو کچھ ہو جائے تو میرا دل کسی بات میں نہیں لگتا...... ہر وقت یہی دھیان رہتا ہے انہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا...... میں تو اس تصور سے ہی آدھی مر جاتی ہوں باجی!''

''پگلی...... ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔ بس ہر وقت اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ ذرا سی بیماری سے تم اس قدر پریشان ہو گئیں۔ ارے یہ الٹیاں دست تو تو معمولی بچوں

کو ہو جاتے ہیں۔ معمولی سی بیماری' معمولی علاج سے رفع ہو جاتی ہے۔ تم کیا الٹا سیدھا سوچنے لگیں؟''

''بس باجی......'' اس کی آواز مزید بھیگی ''میں تو ایسی ہی ہوں۔ میری زندگی میں تو جی ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔ بہت چاہتی ہوں انہیں۔''

''بسمہ......! باجی کو چائے پلا۔'' اندر سے رشید کی آواز آئی تھی۔

''باجی!'' پھر قدرے توقف سے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اس پگلی کو کچھ کھلا پلا جانا۔ بیمار میں ہوا ہوں کھانا پینا اس نے چھوڑا ہوا ہے۔ صبح سے بھوکی بیٹھی بس میرا چہرہ ہی دیکھتی جاتی ہے' جیسے میں مرنے والا ہوں۔''

بسمہ اس کے الفاظ پر رو پڑی۔

''دیکھا باجی آپ نے...... کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں تو ان پر کچھ ظاہر بھی نہیں کرتی۔ ان کے کہنے پر میں نے کپڑے بھی بدلے ہیں۔ ان کی پسند کے پھول بھی پہنے ہیں۔ کوئی میرا جی کرتا تھا یہ سب کچھ کرنے کو؟''

''پھر کھانا بھی کھا لے میرے کہنے پر۔'' اندر سے رشید بولا۔ ''کھانا کیوں نہیں کھاتی؟''

''اندر سے من مرا ہو تو کھانا اندر جاتا ہی نہیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

میں اسے کیا سمجھاتی؟ ان دونوں کی یہ مثالی محبت دیکھ کر میں تو بس چپکی رہ گئی تھی۔ بسمہ کی صورت دیکھ کر میں اپنی صورت سنوارنے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔ لیکن یہ محبت' یہ چاہت' یہ اظہار کی بے پایاں دولت...... یہ میں کہاں سے لاتی؟

''دیکھ بسمہ...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' رشید اسے دکھانے کو تن کر کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا چل کپڑا لا۔'' میں اپنی موٹر سائیکل صاف کر دوں۔ کل سے بے چاری میلی کھڑی ہے۔''

''رہنے دیں جی!'' بسمہ ناراض ہو گئی۔ ''اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہے اور موٹر سائیکل کی اس قدر فکر ہے' یہ دو دن میلی کھڑی بھی رہی تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔''

''بگڑتا کیوں نہیں پگلی! موٹر ہے موٹر۔ صفائی ستھرائی نہ ہو تو اس کی زندگی آدھی رہ جاتی ہے اس کا جتنا خیال کرو اتنا ہی بندے کا ساتھ دیتی ہے' لا کپڑا۔''

''میں نہیں لاتی جی۔'' وہ خفا ہو گئی ''بھلا یہ کون سی بات ہوئی۔ جب تلک آپ ٹھیک نہیں ہو جاتے میں نہیں اس کو ہاتھ لگانے دوں گی۔''

''ارے میں ٹھیک ہوں بسمہ!''

رشید نے ادھر ادھر دیکھ کر خود ہی کپڑا ڈھونڈ لیا اور بیٹھ کر موٹر سائیکل صاف کرنے لگا۔

''یہ تو جی بندے پر ہے وہ موٹر کا کتنا خیال رکھ سکتا ہے۔'' وہ مسلسل بول رہا تھا۔

''اس کا تو جی جتنا خیال کرو' جتنے ناز اٹھاؤ کم ہے۔''

''میری سوت ہے باجی یہ!'' بسمہ جل کر مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

''جب دیکھو اس گھوڑی کے پاس بیٹھے اسے چمکا رہے ہوتے ہیں۔'' رشید کی جیسے ساری بیماری رخصت ہو گئی تھی۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے بیٹھا اپنی موٹر سائیکل سے باتیں کر رہا تھا۔

میں اس روز زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکی۔ اٹھ کر گھر چلی آئی۔ صائمہ اور اسد امتحانوں کی تیاری کر رہے تھے' ہلو ان کے پاس بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ تینوں اپنی اپنی مصروفیت میں گم تھے۔ میں کچھ دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ میرا اثاثہ تھے' میرا کل اثاثہ! پھر میں نے گھر پر نگاہ دوڑائی۔ یہ ہمارا اپنا گھر نہ تھا۔ کرائے پر تھا لیکن اس میں موجود ہر شے میں نے بنائی تھی۔ میاں کی تنخواہ اتنی نہ تھی کہ گزارا با سانی ہوا کرتا لیکن اس کے باوجود اس تنخواہ میں سے رقم پس انداز کر کے' کمیٹیاں ڈال کر میں نے تنکا تنکا جوڑ کر آشیانہ بنایا تھا۔ خدا کا شکر تھا' گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ زندگی عزت سے گزر رہی تھی۔

لیکن دل ...... میں نے دل کو ٹٹولا۔ دل کہاں تھا؟ کم عمر الہڑ لڑکیوں کا دل تو ایک ضدی بچے کی مانند ہوتا ہے۔ کیسے کیسے جتن کر کے وہ اس ضدی بچے کو بہلائے رکھتی ہیں۔ آئندہ آنے والے دنوں کی آس دلا کر منا کر خود سے لگائے رکھتی ہیں۔ اپنے ضدی بچے میں مگن رہتی ہیں۔ پھر وقت ایسی چال چلتا ہے کہ خبر ہی نہیں ہوتی کہ زندگی کے جھمیلوں میں کب اس ضدی بچے کا ہاتھ' ہاتھ سے چھوٹا اور کب وہ مصروفیت کی بھیڑ میں گم ہوا۔ ہوش آتا ہے تو سفر اتنا بیت چکا ہوتا ہے کہ پھر اس بچے کے ملنے کی امید بھی نہیں رہتی۔

میرا دل بھی ایک ضدی بچہ تھا۔ مجھے یاد آیا شادی سے قبل کتنا انتظار تھا اس رشتے کو جاننے کا' جسے میاں بیوی کا رشتہ کہتے ہیں۔ روٹھنے منانے کی باتیں' پیار محبت کے قصے' قسمیں وعدے' چاندنی راتوں میں ہاتھ میں ہاتھ دیے گھومنے کا انتظار ...... کیسی کیسی حسرتیں

تھیں اس ضدی بچے کی۔ آج بسمہ اور رشید کی محبت اور ایک دوسرے سے والہانہ لگاؤ دیکھ کر کیا کچھ نہ یاد آ گیا۔

''بسمہ جیسی صورت کسی طور مل بھی جاتی تو رشید جیسی محبت کہاں سے میاں کے دل میں ڈالتی میں؟''

انہوں نے تو گھونگھٹ اٹھا کر بھی چاہت کا ایک لفظ نہ بولا تھا تو شادی کے پندرہ سال بعد میں ایسا پیار کہاں سے پا سکتی تھی؟ ہائے! اپنا ضدی بچہ اور اس کی وہ سب ضدیں مجھے ٹوٹ کر یاد آئیں۔ میں منہ سر لپیٹ کر پڑ گئی۔ بار بار رشید کی آواز میرے کانوں میں گونجتی۔

''باجی! اس پگلی کو کچھ کھلا پلا جانا۔''

''ارے کچھ کھا لے بسمہ!'' پھر بسمہ کی باتیں یاد آتیں۔

''میری زندگی میں تو جی ان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بہت چاہتی ہوں انہیں۔''

ہم نے تو کبھی ایسی باتیں نہ سنی تھیں نہ کی تھیں۔ شادی ہوئی تو علم ہوا میاں صاحب غصے کے تیز ہیں۔ ذرا احتیاط سے کام لینا ہے۔ اسی احتیاط میں ان سے دور دور رہے' وہ بھی اپنے رعب میں رہتے تھے۔ میاں بیوی کے بجائے استاد شاگرد کا رشتہ بن گیا یا غلام اور آقا کا کہہ لیجیے پھر کچھ وقت گزرا۔ مجھے ان کی اور ان کو میری طبیعت کا اندازہ ہو گیا۔ میرا ڈر بھی ختم ہو گیا ان کے رعب میں بھی کمی آتی گئی لیکن اس دوران صائمہ اور اسد کی مصروفیات میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آنے کا موقع پھر بھی نہ مل سکا' جس میں محبت اور چاہت کی ایسی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ بس کام چلتا رہا اور آج تک چل رہا تھا۔ کبھی اتنا احساس بھی نہ ہوا کہ آس پاس نظر آنے والے بیشتر جوڑوں کے درمیان اسی قسم کے روابط قائم تھے۔

میاں بیوی کے رشتے میں پائے جانے والی محبت اور الفت تو زندگی کی خوشیوں کی اساس ہے۔ یہ دولت ہاتھ ہو تو زندگی باد صبا کے نرم جھونکے کی مانند گزر جاتی ہے۔ اور خبر بھی نہیں ہوتی کہ کب کہاں کس دکھ نے چھوا اور کس تکلیف سے کیسے دامن چھڑایا۔

ایک دوسرے کی محبت کا ہاتھ تھام کر چلنے والوں کو پیروں میں چبھنے والے کنکروں' پتھروں کا تو احساس تک نہیں ہوتا۔ کوئی کانٹا زیادہ تکلیف دہ ہو تو بھی ایک دوسرے کی بے لوث رفاقت کام آتی ہے۔ درد جلدی ہلکا پڑ جاتا ہے۔

لیلیٰ مجنوں' شیریں فرہاد' ہیر رانجھا' سسی پنوں کی کہانیوں پر بہت حیرت بھی نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے کہ ہم خود بھی ایسی ہی کسی کہانی کا کردار ہیں۔ کوئی ہم سے ایسی ہی لافانی اور لاثانی محبت کرتا ہے۔

بسمہ اور رشید کا پیار دیکھ کر نجانے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ وہ سب کچھ جو دل مجروح پر بیتا اور وہ سب کچھ جو نہ بیت سکا' کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔

میاں صاحب تشریف لائے تو میں یونہی منہ لپیٹے پڑی تھی۔ بچے اپنا کام سمیٹ کر ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

''ارے بھائی...... کھانا وانا ملنا ہے یا باہر جائیں کہیں؟'' وہ لباس تبدیل کر چکے تو میری ''جیسے تھے'' والی پوزیشن دیکھ کر قریب چلے آئے۔ میرا دل اور بھی بھر آیا۔ مجال ہے جو کبھی اس آدمی نے کھانا' پانی اور چائے کے علاوہ کوئی دوسری بات پوچھی ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ کیا قریب المرگ ہو جو یوں اَنوائی کھٹوائی لئے پڑی ہو۔

''لے لیں کھانا...... پکا رکھا ہے۔'' میں روہانسی ہو کر بولی۔

''ہائیں! کیا مطلب؟'' پندرہ سالوں میں یہ پہلی انوکھی بات تھی سو حیران ہوئے بغیر نہ رہ پائے۔

''مطلب یہ کہ میرا جی ٹھیک نہیں ہے...... میں نے منہ پر سے کپڑا ابھی نہیں ہٹایا تھا۔

''یہ جی کیا ہوتا ہے؟ اور آج اس کے خراب ہونے کی وجہ کیا ہوئی؟'' وہ بے نیازی سے پوچھنے لگے۔ میں نے چہرے پر سے کپڑا اٹھایا اور انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔

''کیا ہو گیا ہے آج تمہیں؟'' وہ جھلا ہی گئے۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کیا ناقدری سی ناقدری تھی۔ کتنے دنوں سے اپنا خیال رکھ رہی تھی۔ اپنا عورت پن بھول کر' خود کو الھڑ سی دوشیزہ جان کر نوک پلک سنوارنے میں لگ گئی تھی۔ یہ بھول ہی گئی کہ دیکھنے والی نگاہ نہ ہو تو ہیرا بھی کسی ویران کھائی میں پڑا کوئلہ برابر ہوتا ہے۔ ہیرا' تو ہیرا تب ہوتا ہے جب اسے تراشا جائے' زیور میں لگایا جائے' سراہا جائے۔ میں روئے جا رہی تھی اور وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''بیگم! معاملہ کیا ہے؟'' آخر کو وہ قدرے پریشان ہو ہی گئے۔

''یہ بتائیں آپ کو مجھ میں کسی تبدیلی کا احساس ہوا؟''

''تبدیلی...... کیسی تبدیلی؟'' وہ کچھ اور پریشان ہوئے۔

''مجھے تو نہیں پتا چل رہا ہے۔ کیا بات ہو گئی تم ہی بتاؤ؟''

''یا اللہ...... سر پھوڑنے کو اگر پتھر دینا تھا تو پھر دل کی جگہ بھی کوئی پتھر ہی لگاتا' دل کی جگہ شیشہ اور شوہر کے نام پر پتھر...... عمر کیسے گزرے گی؟'' میں سسک پڑی۔ جس کی خاطر مہینے بھر سے آئینے توڑ رہی تھی اس نے کتنی جلدی دل توڑ ڈالا یہ دو لفظ کہہ کر' حالانکہ باجرہ کل ہی کہہ رہی تھی کہ میں نکھری لگنے لگی ہوں۔

''کسی لیڈی ڈاکٹر سے مل لو۔'' وہ مزید گویا ہوئے ''میں تو واقعی پریشان ہو گیا ہوں...... آج کے دور میں تو دو بچے ہی بہت ہیں۔ ہمارے تو پھر تین ہیں۔ چوتھے کی آمد سے تو اخراجات......''

''کیا کہے جا رہے ہیں؟'' میں بھنا اٹھی ''میں نے ایسا کب کہا؟''

''پھر یہ کس تبدیلی کی نشان دہی ہو رہی ہے؟'' وہ مجھ سے زیادہ بھنائے۔

''ہائے ہائے...... اقبال صاحب......! آپ نے مجھے بہت مانوس کیا ہے......'' میری آواز رندھ گئی۔ ''آج پندرہ سالوں میں پہلی بار شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ زندگی جیسی نعمت جو صرف ایک بار ملتی ہے...... اس میں محبت کے نام کا خانہ روز اول سے خالی پڑا ہے' اب تک خالی ہے۔ کیسی ستم ظریفی ہے...... عورت کو محبت نہ ملے؟'' میں پھر رونے لگی۔

''ایسا ہی ہے جیسے پیاسی دھرتی کو بادل سے بوند بھر پانی نہ ملے' گلستاں کو بادِ صبا نہ ملے' خالی جام کو شراب نہ ملے......''

''کیا بک رہی ہو بیگم؟'' ان کی صورت پر بارہ بجنے لگے۔

''یہ وہ حقیقت ہے جو آپ کو ضرور ہی جاننا چاہئے آپ جیسے مرد جو اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر اپنی عورت کو محبت سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ مرد جو یہ سوچتے ہیں کہ محبت کے' شیرینی کے دو بول عورت کو اس کی اوقات نہ بھلا دیں' وہ غلام سے آقا بننے کا نہ سوچنے لگے۔ محبت تو واقعی سونے کا تاج ہے جس عورت کے سر سجا ہو وہی حسینہ عالم ہے لیکن اقبال صاحب جو مرد یہ تاج اپنی بیوی کو پہناتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اس کی داسی بن جاتی ہے۔ بے مول بک کر انمول ہو جاتی ہے۔ جیسے بسمہ!''

"زہرہ...... ! آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"ایک اندھے غلام کو پہلی بار اپنی غلامی کا احساس ہوا ہے تو پیروں پر پڑی زنجیر چبھنے لگی ہے...... حالانکہ زنجیر کو پیر میں پڑے تو عرصہ ہو گیا......" میں نے تاسف سے سر ہلایا۔

"کیسی زنجیر؟" میں نے انہیں دیکھا۔

"یہ ٹھیک ہے اقبال صاحب کہ عورت گھر بنانے کو ہی پیدا کی گئی ہے۔ آگے تخلیق کے عمل کو جاری رکھنے کے لئے ہی تخلیق کی گئی ہے...... اپنا گھر بنا کر، سجا سنوار کر، بچے پیدا کرکے، پال پوس کر، عورت اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتی ہے...... لیکن یہ بھی روشن حقیقت ہے کہ اس عورت کے سینے میں اس کے خالق نے ایک نرم و نازک پودا لگایا ہے جسے دل کہتے ہیں۔ اس پودے کی حفاظت کرنا اسے محبت کی خوراک دینا' اسے زمانے کی تلخیوں کی دھوپ سے بچانا' مرد کا کام ہے۔

کتنے مرد ہیں جو اپنا یہ کام دیانت داری سے پورا کرتے ہیں؟ جو مرد اپنا یہ کام دیانت داری سے نہیں کرتے' ان کی عورتوں کو گھر قید خانہ اور زندگی غلامی لگتی ہے اور جو عورتیں یہ سب کچھ محسوس نہ کریں وہ اندھا غلام ہوتی ہیں۔ میں بھی آج تک اندھا غلام نبی رہی۔ پیدائشی جرم! جسے غلامی کا احساس تک نہیں ہوتا...... مگر بسمہ اور رشید کو دیکھ کر......"

"کیا دیکھ لیا آخر؟" وہ جھلا کر کھڑے ہو گئے "نجانے آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ بھئی! میں یہ سب فضول خرافات نہیں سن سکتا۔ تمہیں شکایت ہے تو شکایت ہی سہی۔ کسی بے وقوف عورت نے کان بھرے اور یہ محترمہ شروع ہو گئیں۔ کھانا لا دو مجھے۔"

وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں حسرت کا نمونہ بنی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ محبت کی کمی کے احساس کا وہ پہلا اور آخری دورہ تھا جو مجھے پڑا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اقبال صاحب سے کچھ نہیں کہا۔ چند دن کے بعد ہی ایک خوشخبری ملی۔ اقبال صاحب کی ترقی ہو گئی اور تبادلہ بھی' دوسرے شہر جا کر چارج سنبھالنے کے لئے آرڈر آ گئے۔

میں خوش بھی تھی متردد بھی۔ ترقی کی خوشی تھی اور آناً فاناً سارا ماحول بدل جانے کے خیال سے پریشان بھی۔ یہ محلّہ تو اپنے گھر کی مانند تھا۔ سب جانتے تھے' پہچانتے تھے' عزت کرتے تھے' ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ نئی جگہ لوگوں کا تصور خوش بھی کر رہا تھا

اور پریشان بھی۔ اقبال صاحب دوسرے شہر چلے گئے۔ چند دن بعد ہم لوگوں کو بھی کوچ کرنا تھا۔ میں گھر کا ضروری سامان پیک کرتی عزیز رشتہ داروں سے' محلّہ داروں سے ملاقاتیں کرتی پھر رہی تھی۔ سب سے آخر میں بسمہ کے گھر بھی گئی۔

وہ ہرے رنگ کا لباس پہنے' ہری اور لال چوڑیوں سے کلائیاں بھرے خوش خوش پھر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اور بھی خوش ہوئی۔

"آئیں باجی...... ! میں ایک خوشخبری سنانے آ رہی تھی اچھا ہوا جو آپ خود ہی چلی آئیں۔" اس نے مٹھائی کا ڈبہ میرے سامنے رکھ دیا۔

"منہ میٹھا کریں۔"

"خبر تو سناؤ۔ منہ بھی میٹھا کرتے ہیں۔" میں نے اس کا ہمیشہ کی طرح چمکتا' روشن چہرہ دیکھا۔

"ہم نے یہ گھر خرید لیا ہے۔ پورے ایک لاکھ پچاس ہزار میں۔"

"ہائیں بڑا سستا بیچا دینو کاکا نے؟ خیر بہت مبارک ہو تمہیں۔" میں نے برفی کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

"وہ جی اسے ضرورت تھی پیسوں کی اور پھر یہ گھر بک بھی نہیں رہا تھا۔ چھوٹا بہت ہے نا...... ہمارے لئے تو خیر بہت اچھا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔

"ہماری کمیٹی نکلی تھی پچاس ہزار کی' پچاس میں نے اپنا زیور بیچ کر کئے' باقی کے رشید نے آفس سے قرضہ لے لیا۔ آہستہ آہستہ کٹتا رہے گا۔" وہ مجھے اپنوں کی طرح بتا رہی تھی۔

"چلو اچھا ہوا۔ گھر تو اپنا ہو گیا نا! قرضہ بھی اتر جائے گا اور زیور بھی نیا بن جائے گا۔ شوہر خیال کرنے والا ہو۔ تو عورت کو گہنوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی' اصل زیور تو شوہر کی سچی محبت ہے۔"

"سچ بولیں باجی!" وہ شرما کر بولی "یہ تو جی بہت چاہتے ہیں مجھے...... اپنی جان سے زیادہ۔" میرے دل سے پھر ہوک اٹھی۔

"بسمہ...... میں بھی ایک خبر سنانے آئی تھی۔ تمہیں۔" میں نے خود پر قابو پا کر'

سانس بھر کر کہا۔ ''اقبال صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ دوسرے شہر جا رہے ہیں۔''

''ہائے سچ باجی!'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''مجھے تو اداس کر دیا آپ نے۔''

''اداس کیوں ہوتی ہو؟'' میں نے اس کا گال تھپتھپایا ''جگہیں تو بھر ہی جاتی ہیں۔ یادیں مدھم پڑ جاتی ہیں' کسی کے جانے سے فرق تھوڑا ہی پڑتا ہے۔''

''سچ کہتی ہیں باجی۔'' رشید نجانے کس وقت چلا آیا تھا۔ ''پھر بھی اچھے لوگ مشکل سے بھولتے ہیں۔'' ''بسمہ! تو نے باجی کو دوسری خوشخبری نہیں سنائی؟'' وہ بہت شوخ ہو رہا تھا۔

بسمہ نے اس کو گھور کر دیکھا اور جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ دوسری خبر کیا ہو سکتی تھی' مجھے از خود پتا چل گیا۔

رشید ہنستا ہوا صحن میں اپنی موٹر سائیکل کے پاس چلا گیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے صاف کرنے لگا۔

ان میاں بیوی کی مثالی محبت کو نظر نہ لگنے کی دعا کرتی میں واپس چلی آئی۔

شہر بدلا' زندگی بدل گئی۔ سال تسبیح کے دانوں کی طرح ایک کے بعد ایک گرتے چلے گئے۔ عمر گزرنے کا بھی پتہ چلتا ہے؟

دس سال گزر گئے۔ میری صائمہ کی شادی ہو گئی۔ وہ بیاہ کر دوسرے شہر چلی گئی۔ اسد انجینئرنگ کالج چلا گیا۔ ہلو نے میٹرک کر لیا۔

تب ایک دن اقبال صاحب نے مجھے ریٹائر ہونے کی نوید سنائی۔ عمر کا آخری حصہ کس قدر جلد سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔...... پلٹ کر کچھ دیکھنے کی' ٹھہر کر کچھ سوچنے کی بھی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ اقبال صاحب ریٹائر ہوئے تو ہم واپس پہلے شہر لوٹ آئے۔ یہ آبائی شہر تھا۔ یہاں میرا میکہ تھا' اقبال صاحب کے رشتے دار تھے۔ ہم نے محکمے سے ملے پیسوں سے یہیں ایک گھر خرید لیا۔ کچھ عرصہ نیا گھر سیٹ کرنے میں گزر گیا پھر مجھے پرانے عزیزوں' رشتہ داروں کی یاد ستائی۔ لوگوں سے بچھڑے عرصہ ہو گیا تھا۔

میں اب فارغ تھی۔ بیٹی بیاہ دی تھی۔ بیٹے جوان ہو گئے تھے۔ جی بھر کر گھومتی پھرتی تھی۔ کبھی کسی کے گھر' کبھی کسی کے گھر۔

تب ایک دن مجھے اپنی پرانی بھولی ہاجرہ یاد آئی' دوسری پڑوسن ثریا کی بھی یاد ستائی پھر مجھے بسمہ یاد آئی۔ بسمہ! جس کی یاد آج بھی اولین شباب کے [illegible] تھی۔

محسوس کر کے انسان عجیب سی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر پرانے محلے میں گئی۔ وہاں سے بیشتر لوگ جا چکے تھے۔ کیونکہ ہماری طرح زیادہ تر لوگ وہاں کرائے کے گھروں میں آباد تھے۔ ہاجرہ البتہ وہیں تھی۔ اس سے مل کر مجھے علم ہوا بسمہ مر گئی تھی۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ وہ خوشبو' وہ چاندنی' وہ روشنی کا پیکر بسمہ! بھلا کیسے مر گئی؟ میں ہاجرہ کے گھر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکی۔ وہاں سے نکل کر سیدھی رشید کے گھر چلی آئی۔

اندر کا ماحول تقریباً وہی تھا۔ آج سے دس سال پیشتر والا۔ فرنیچر بھی وہی' پردے بھی وہی' ہاں البتہ دیوار پر لگی تصویر بدل گئی تھی۔ رشید کے ساتھ شمع کی تصویر تھی۔ اس کی نئی دلہن وہ بھی اچھی لڑکی تھی۔ مجھ سے تپاک سے ملی۔ رشید سے اس کی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے۔ بسمہ کے دونوں بچوں کی اب وہی ماں تھی۔

''ان کی ماں بڑی اچھی عورت تھی۔'' میں نے آٹھ سالہ بیٹی اور دس سالہ بیٹے کو ایک دوسرے سے کھیلتا دیکھ کر تاسف سے کہا تھا' ''بہت پیاری تھی' نرم و نازک سی!'' شمع پہلو بدل کر مسکرا دی۔

''ہاں جی سنا تو ہے۔ مگر یہ کہتے ہیں...... مجھ سے انہیں زیادہ لگاؤ ہے!''

''چھن۔'' میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا ''کون رشید؟''

''ہاں جی...... بہت چاہتے ہیں مجھے......'' میں اٹھ کر باہر چلی آئی۔ رشید پنجوں کے بل بیٹھا موٹر سائیکل صاف کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بڑے دن بعد آئیں باجی؟''

''ہاں رشید! تم سناؤ' بسمہ کا سن کر بہت افسوس ہوا' کیا ہوا تھا اسے؟''

''بس جی بے چاری کی قسمت ہی خراب تھی۔ دونوں بچے آپریشن سے ہوئے۔ بیماریاں جان کو چمٹ گئیں' بس جی چلی گئی بے چاری!'' اس کی آنکھوں میں کوئی پرانا خواب نہ جاگا تھا۔ میں تو بس رشید کی صورت دیکھتی رہی۔ وہ اسے گھر دے گئی تھی' دو بچے دے گئی تھی' اپنی زندگی دے گئی تھی۔ وہ اس کا ذکر کر کے پھر بے فکری سے اپنی موٹر سائیکل صاف کر رہا تھا۔

''جگہیں تو بھر جاتی ہیں۔ یادیں مدھم پڑ جاتی ہیں کسی کے جانے سے فرق تھوڑا ہی پڑتا ہے۔'' مجھے برسوں پہلے اسی جگہ کہے گئے اپنے الفاظ یاد آئے۔

لیکن رشید نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اچھے لوگ مشکل سے بھولتے ہیں۔ اس نے تو

اپنے کہے کا پاس بھی نہ کیا۔

''تمہاری موٹر سائیکل تو آج بھی بالکل نئی لگتی ہے رشید!'' میں نے سانس بھر کر سوچوں کے اثر سے نکلنے کے لئے برجستہ تذکرہ کیا تھا۔

''ہاں جی!'' وہ خوش ہو گیا۔ ''یہ تو جی زندگی کی ساتھی ہوتی ہے۔ اس کا تو جی جتنا خیال کرو جتنا جی جان سے اسے سنوارو...... یہ اتنا ہی ساتھ دیتی ہے۔'' میں سر جھکا کر باہر نکل آئی۔

''جو خیالات ایک بے جان موٹر کے بارے میں رکھتے ہو وہی خیالات اگر ایک سانس لیتی عورت کے لئے رکھتے تو...... بسمہ کیوں مرتی؟'' میں تاسف سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔

چاندسی دلہن

آج عمادالدین گھر لوٹ رہا ہے۔ میں بے پناہ خوش ہوں۔ اس قدر خوش کہ مجھے اپنے اندر خوشی کا ایک سمندر موجزن محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج میری عمر بھر کی خواہشات کی تکمیل ہوگئی ہے۔ میری ساری دعائیں مقبول ہوئیں۔ میں ہر پریشانی' ہر فکر سے پاک بالکل ہلکی پھلکی ہوگئی ہوں۔

ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ عماد کا داخلہ! انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ وہ چار سال کے لئے مجھے چھوڑ کر دوسرے شہر جا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا لیکن میں بظاہر خوش' اندر سے بے حد فکرمند اور پریشان تھی۔ زندگی میں کبھی اس سے جدا جو نہ ہوئی تھی۔ پل پل اسے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا تھا۔ ہر ہر لمحہ اس کی حفاظت کی تھی۔ وہ ایک ننھی سی کونپل کی مانند تھا۔ میں نے اسے اپنے خون دل سے سینچا تھا۔ اپنی تمناؤں کو خاک کر کے اسے پروان چڑھایا تھا۔ پھر اس کی اس جدائی سے' خواہ وہ عارضی ہی تھی میں کیونکر نہ پریشان ہوتی؟ لیکن میں مجبور بھی تھی یہ اس کے بہتر مستقبل کا سوال تھا۔ اسے آگے' بہت آگے جانا تھا۔ بڑا آدمی بننا تھا اور یہ میری ہی آنکھوں کا سب سے پرانا اور سب سے دیرینہ خواب تھا۔ میری زندگی میں عماد کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ سو وہ ہی میری زندگی تھا۔

میں نے ایک نگاہ بڑی بے چینی سے وال کلاک پر ڈالی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ وہ بس پہنچنے ہی والا تھا۔ اسے ساڑھے دس بجے ٹرین سے پہنچنا تھا۔ پھر اسٹیشن سے گھر تک کا فاصلہ تقریباً گھنٹہ بھر کا تھا۔ میں اسے لینے کے لئے اسٹیشن جانا چاہتی تھی۔ لیکن عماد نے مجھے منع کر دیا تھا۔

”سردی بہت زیادہ ہے امی! آپ گھر پر ہی ٹھہریئے گا میں خود اسٹیشن سے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اب میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں...... جوان ہو گیا ہوں۔“

وہ ہنس رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شرارت بول رہی تھی۔ میں نے جب ریسیور کریڈل پر ڈالا تو اس کا آخری فقرہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

”اب میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔ جوان ہو گیا ہوں۔“

اور تب سے اب تک میرے اندر سکون اور طمانیت کا بھرپور احساس موجود تھا۔ میری ریاضت پوری ہو گئی تھی۔ میرا سفر مکمل ہوا تھا۔ میرا عماد جوان ہو گیا تھا۔ آج تک میں نے اسے تحفظ کا بھرپور احساس دینے کی کوشش کی تھی، اب مجھے اس کے تصور سے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔

میں اپنے فلیٹ کی بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ نیچے سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ میرا عماد بھی اس شہر کی سڑک پر محوِ سفر ہو گا۔ وہ بس پہنچتا ہی ہو گا۔

میں انتظار کی شدید ترین کیفیت کا شکار تھی جب بیل بجی۔ میرے دل کی دھڑکن لمحہ بھر کو رکی پھر تیز تر ہو گئی۔ تقریباً دوڑتی ہوئی میں دروازے پر پہنچی اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ میرا چوبیس سالہ خوبرو، جوان بیٹا میری نظروں کے سامنے تھا۔

”امی!“

نجانے اچانک ہی کیا ہوا میں نے اس کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔

”عماد۔ میرا بیٹا۔ میری جان......“

”امی .... پلیز امی۔“ وہ مجھے سینے سے لگائے اندر لے آیا۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ خوشی کے موقع پر بھی کوئی روتا ہے۔“

”غم سہتے سہتے جن کی آنکھیں پتھرا جائیں، وہ خوشی کے موقع پر ہی رویا کرتے ہیں میرے بیٹے!“ میرے آنسو کسی طور نہ تھم رہے تھے۔

”غم اور تکلیفوں کا دور گزر گیا امی! اب ہمارے چاروں طرف خوشی ہی خوشی رقصاں ہو گی انشاءاللہ۔“

اس نے جیب سے رومال نکال کر میرے آنسو پونچھے۔ ”آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

”اچھا۔ اب تم فریش ہو تو میں تمہارے لئے کھانا نکالتی ہوں۔ میں نے ساری چیزیں تمہاری پسند کی بنائی ہیں۔“ میں بمشکل خود پر قابو پا سکی تھی۔

”میں جانتا تھا۔ اسی لئے میں نے ٹرین میں کچھ نہیں کھایا۔ سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“

وہ اٹھ کر گیا تو میں نے اس کا بیگ کھول کر اس کے لئے کپڑے نکالے۔ کافی رنگ کی جرسی میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ یہ جرسی پچھلے سال میں نے اس کے لئے بنی تھی۔ یہ ایک بڑا مشکل ڈیزائن تھا جسے میں نے بہت محنت سے پورا کیا تھا۔ میں کچھ دیر کھڑی اسی جرسی کی بناوٹ پر غور کرتی رہی۔ پھر اسے کپڑوں پر رکھ کر کچن میں چلی آئی۔ آج میں فجر کی نماز پڑھ کر ہی اس کے لئے کھانا پکانے میں لگ گئی تھی۔

میں نے اس کی پسند کی کتنی ہی چیزیں بنا ڈالی تھیں۔

پلاؤ، شامی کباب، پسندے، مسور کی دال کی پھلکیاں، شاہی ٹکڑے اور اورنج کیک۔

وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھا تو حیران رہ گیا۔

”ارے..... میری ماں! اتنا ہلکان کیا ہے آپ نے خود کو؟ کب سے لگی ہوئی ہیں؟“

”فجر سے!“ میں فخر سے مسکرانے لگی۔ ”اور ہلکان نہیں ہلکی ہو گئی ہوں۔ خود کو بہت چاق و چوبند اور فریش محسوس کر رہی ہوں۔“

”فریش تو آپ ہمیشہ ہی رہتی ہیں۔ میری ماں تو سدا بہار ہے۔ پتا ہے امی! میرے دوست مجھ سے اتنا جیلس ہوتے ہیں اس بات پر۔ ان سب کی مائیں اتنی بوڑھی سی ہیں اور میری ماں۔ ایک دم فریش اور خوبصورت۔ آپ ماں نہیں میری باجی لگتی ہیں۔“

وہ کھاتے ہوئے بولتا جا رہا تھا اور میری آنکھیں سوچوں کی دھند میں کھو رہی تھیں۔

میں نے بی اے کیا تھا تو والدین نے اگلے مہینے حماد الدین سے میرا بیاہ کر دیا تھا۔ میں محض بیس برس کی تھی۔ اگلے برس یعنی اکیس سال کی عمر میں عماد کی ماں بن گئی تھیں اور چوبیس سال کی عمر میں حماد الدین کی بیوہ!

بس میری خوشیوں کی بس اتنی ہی عمر تھی۔ والدین کے گھر لوٹ کر آئی تو احساس

ہوا کہ اب یہ گھر ماں باپ کا نہیں رہا' بھاوجوں کا ہو گیا ہے اور میری اور میرے بیٹے کی وجہ سے انہیں ان کا گھر چھوٹا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے حماد الدین کی چھوڑی ہوئی رقم سے فلیٹ خرید لیا اور عماد اور اپنی ماں کو لے کر یہاں آبسی۔ عماد کو میں نے اسکول میں داخل کرایا اور خود یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ میں ماسٹرز کر کے لیکچرر شپ حاصل کرنا چاہتی تھی کیونکہ زندگی طویل تھی اور حماد الدین کی چھوڑی ہوئی رقم بے حد مختصر!

میں ماسٹرز کرنے لگی۔ کم عمر تھی' خوبصورت بھی تھی۔ کئی نظروں میں سوال ابھرا' کئی ہاتھ دراز ہوئے لیکن میں کسی ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھ سکی۔ میرے ہاتھ ننھے عماد کی محبت نے باندھ دیئے تھے' کسی اور جانب توجہ دینے کے لئے مجھے عماد کو نظر انداز کرنا پڑتا اور ایسا کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ عماد میری زندگی کا عنوان تھا۔ زندگی کی کتاب کو کسی نئے نام کی ضرورت نہ رہی تھی۔ میں نے ماسٹرز کر کے لیکچرر شپ حاصل کر لی۔ زیست کی گاڑی قدرے سہل انداز میں چل پڑی میری ماں نے مجھ پر بہت زور دیا کہ میں دوسری شادی کر لوں۔ وہ عماد کی پرورش بہت اچھے طریقے سے کر سکتی ہے۔ لیکن میں کسی طور پر نہ مانی۔ زندگی میں کئی چیزوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن عماد کی محبت ہر کمی کو نامحسوس انداز میں مکمل کر دیتی تھی۔ میں پژمردہ اور اداس ہوتی تو اس کی ایک مسکراہٹ مجھے اندر تک شاداب کر ڈالتی۔ کٹھن راہوں پر چلتے چلتے میرا سانس پھولتا تو اس کے ننھے ننھے بازو میری گردن میں حمائل ہوتے اور میں بالکل پرسکون ہو جاتی۔ میرا سانس بحال ہو جاتا۔ اکھڑتے قدم پھر سے جم جاتے۔ عورت کے ہر نام اور عورت پن کے تمام جذبوں کو فراموش کر کے میں محض ماں رہ گئی اور "ماں" صبر اور استقامت کا دوسرا نام ہے۔ "ماں" ہمیشہ "ماں" رہتی ہے کبھی نہیں تھکتی' کبھی نہیں مرجھاتی۔

عماد کو بھی میں نے ہمیشہ بہترین اسکولوں میں پڑھایا۔ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس کی تعلیم پر صرف کیا۔ اپنے اوپر تو میں نے زندگی کی ہر خوشی حرام کی ہوئی تھی۔ ایک ایک جوڑا میں برسوں چلاتی تھی۔ میک اپ اور زیور کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ گھر کے بجٹ میں نہایت کھینچ تان کر پورا کیا کرتی تھی۔ میری محض ایک ہی آواز تھی۔ زندگی کی دوڑ میں میرا عماد کہیں کسی سے پیچھے نہ رہ جائے' کبھی عماد کو [illegible] نہ ستائے کہ اگر اس کا

باپ زندہ ہوتا تو اسے بہتر زندگی میسر ہوتی' عماد کو کوئی احساس کمتری نہ رہ جائے۔

خدا کا شکر ہے۔ اس نے میری تمام خواہشات کو پورا کر دیا۔ میری ہتھیلیوں پر رقم ہر دعا کو پورا کر دیا۔ لیکن نہیں! ایک دعا ابھی باقی ہے۔

"عماد!" میں نے کچھ دن بعد اسے مخاطب کیا۔ "بیٹا! میں چاہتی ہوں اب اپنے آخری فرض سے سبکدوش ہو لوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس گھر میں تمہاری دلہن لے آؤں۔"

"امی!" وہ چونک اٹھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ابھی تو میں نے عملی زندگی کے میدان میں رکھنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا ہی ہے۔ میں بھلا اس قدر جلد شادی کے متعلق کیسے سوچ سکتا ہوں؟"

"مگر میں نے سوچ لیا ہے۔" میں اطمینان سے بولی "تم نے امتیازی نمبروں سے امتحان پاس کیا ہے۔ آفرز آنا شروع ہو چکی ہیں۔ چند ماہ میں ہی تم اپنی بہترین عملی زندگی کا آغاز کرو گے۔ انشاء اللہ میں چاہتی ہوں اس کے ساتھ ہی تم اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز بھی کرو۔ زندگی بہت مختصر شے کا نام ہے۔ عماد...... ! یہاں پلک جھپکتے بچپن' جوانی اور بڑھاپا گزر جاتا ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہارے لئے بہترین چیزوں کی خواہش کی ہے۔ یہ کہ تم بہترین طریقے سے اپنی عمر گزارو۔ ہر کام وقت پر' سہل انداز میں کرو۔ خوشیوں کا بھی وقت ہوتا ہے۔ عماد...... ! انہیں وقت پر حاصل کرنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ وقت گزر جائے تو خوشیوں میں انوکھا پن نہیں رہتا۔ یہی وقت ہے بیٹے ان باتوں کا۔ تم نے بڑی لگن اور جذبے سے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ اب تم زندگی میں آنے والی فراغت اور خوبصورتی کو محسوس کرو۔"

وہ سر جھکائے میری باتوں پر غور کرتا رہا اور میں جانتی تھی وہ انکار نہیں کرے گا اس لئے کہ اس نے کبھی میری بات کو رد نہیں کیا۔ میں نے جس جذبے سے اس کی پرورش کی تھی یہ اس کا انعام تھا کہ عماد الدین ایک بے حد فرمانبردار اور اطاعت گزار بیٹا تھا۔ اس نے کبھی میری کسی بات پر "نہ" کہنا سیکھا ہی نہ تھا۔

میرے ذہن میں عماد کے لئے کئی ایک لڑکیاں تھیں۔ میں نے سوچا ہوا تھا کہ جب انتخاب کا وقت آئے تو میں اور عماد باہمی مشورے سے ان ہی میں سے کسی ایک لڑکی کو منتخب کر لیں گے۔ ساری کی ساری بہت سلجھی ہوئی' پڑھی لکھی لڑکیاں تھیں لیکن اب جبکہ وہ

لمحہ سر پر اکھڑا ہوا تھا' مجھے کوئی بھی لڑکی اپنے معیار پر پوری اترتی نظر نہ آ رہی تھی۔

میں نے تنہائی میں کئی مرتبہ سوچا۔

میری بڑی بہن کی دو بیٹیاں تھیں۔ فائزہ اور منزہ دونوں ہی بہت پیاری' پڑھی لکھی' نیک سیرت بچیاں تھیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میرا بیٹا عماد بے حد خوبرو' بلند قامت نوجوان تھا جبکہ فائزہ اور منزہ شکل صورت کی تو بھلی تھیں' لیکن ان کے قد بہت چھوٹے تھے۔ میرے خیال میں عماد کے ساتھ ان کا جوڑ نہیں بنتا تھا۔

''میاں بیوی کے قد میں مناسبت ہو تو جوڑی بھلی لگتی ہے۔'' میں نے کئی بار سوچا۔ ''وہ دونوں ہی عماد کے ساتھ نہیں جچیں گی۔''

میں نے اپنی لسٹ سے ان دونوں کو نکال دیا۔

میرے بچپن کی دوست عارفہ کی بیٹی سیماب بھی مجھے بہت پسند تھی۔ وہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ گوری رنگت' سیاہ چمکتی آنکھیں' خوبصورت گھنے بال۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ جایا کرتی تھی۔ ہمیشہ سے ہی اسے دیکھ کر میرے جی میں یہ خیال مچلتا تھا کہ میں عارفہ سے اسے عماد کے لئے مانگ لوں۔

لیکن اب مجھے دھیان آ رہا تھا کہ سیماب بچپن سے ہی ذرا غصیلی اور ضدی واقع ہوئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کے لئے وہ عارفہ کو اکثر پریشان رکھتی تھی۔ بھلا ایسی لڑکی کو میں اپنے عماد کے لئے کیسے بیاہ لاتی۔ وہ تو بے حد سلجھا ہوا' نرم مزاج بچہ تھا۔ اس کے لئے تو شبنم جیسی ٹھنڈی لڑکی ہونی چاہئے تھی تا کہ دونوں کی زندگی خوشگوار انداز میں گزرتی۔

چچا زاد بھائی طفیل کی بڑی بیٹی مومنہ کو بھی میں نے ہمیشہ سے نظر میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑی خوبیوں والی لڑکی تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور خوش مزاج بھی لیکن اب مجھے یہاں بھی ایک مسئلہ نظر آ رہا تھا۔ مومنہ ڈاکٹر بن گئی تھی اور اپنی پریکٹس کرتی تھی اور ساری عمر نوکری کر کے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا تھا کہ نوکری پیشہ عورت گھر اور گھر والوں کو وہ بھرپور توجہ نہیں دے پاتی جو ایک عورت کو دینی چاہئے۔ ایک مکمل اور پرسکون گھر کو ایک مکمل اور پرسکون عورت کی ضرورت ہوتی ہے اور نوکری عورت کو نہ مکمل ہونے دیتی ہے' نہ پرسکون۔

میں نے مومنہ کو بھی ریجیکٹ کر دیا۔ گویا وہ تمام لڑکیاں جو عرصہ دراز سے میری لسٹ میں شامل تھیں' وقت آنے پر از خود لسٹ سے باہر ہو گئیں۔

عماد سے میں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ وہ ہنس دیا۔ ''عماد! میں چاہتی ہوں کہ ایک بھرپور' مکمل لڑکی ہو جو ہمارا گھر خوشیوں سے بھر دے۔ اپنے بیٹے کے لئے میں چاند سی دلہن لانا چاہتی ہوں۔''

''میں نے آپ کو منع کیا ہے؟'' وہ شوخ ہوا ''آپ سورج' چاند' ستارہ جیسی مرضی مخلوق لے آئیں۔''

''تم اپنی پسند بتاؤ!''

''جو آپ کی پسند' وہ میری پسند!''

مجھے اس پر بے حد پیارا آیا۔

''دیکھو بیٹے! مسئلہ یہ ہے کہ تم مجھے اتنے عزیز' اتنے پیارے ہو کہ کوئی لڑکی مجھے ایسی نظر ہی نہیں آتی' جسے میں تمہارا ہم سفر بنا سکوں۔ میں تو نجانے کیا چاہتی ہوں۔ تمہارے حوالے سے میرا معیار کچھ زیادہ ہی بلند ہو گیا ہے۔ اب تم ہی میرا مسئلہ حل کر سکتے ہو۔ کوئی اشارہ تو دو۔''

''امی......!'' وہ کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''آپ کو یاد ہے' نانی امی کی پڑوس میں ایک ڈاکٹر صاحب تھے...... ان کی ایک بیٹی تھی...... نیرہ احمد...... میں جس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ جو میری کلاس میٹ بھی تھی۔''

وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا۔ وہ بچی بے حد پیاری تھی۔ کبھی امی کے گھر آ جاتی تو سب اسے روک روک کر چوما کرتے تھے۔ شہابی رنگت' ستارہ آنکھوں والی وہ بچی مجھے بخوبی یاد تھی' عماد کی بچپن میں اس سے بڑی دوستی تھی۔

''ہاں۔ مجھے یاد ہے۔'' میں خواب کے سے عالم میں بولی۔

''نیرہ سے میری پچھلے سال ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بالکل ویسی کی ویسی ہے امی...... میرا مطلب ہے...... اتنی ہی...... میں نے ایک مرتبہ سوچا تھا کہ آپ سے اس کا ذکر کروں لیکن پھر میں نے سوچا کہیں میری بات سے آپ کو دکھ نہ پہنچے لیکن اب آپ نے خود پوچھا ہے تو......''

''تو تم نے بات اگل دی۔'' میں نے پیار سے اسے دیکھا۔ ''ورنہ دل کی دل میں ہی

رکھتا میرا اکلوتا بیٹا!'' میں نیرہ کے گھر جانے کے لئے بے تاب ہوگئی۔ بھلا ایسا ممکن تھا کہ میرا عماد کسی چیز کی خواہش کرتا اور میں اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے بے تاب نہ ہوتی۔

میرا بس نہ چلتا تھا میں اسی لمحے نیرہ احمد کو اپنے عماد کی دلہن بنا کر لے آتی۔

کچھ وقت سرکا اور خدا نے میری یہ خواہش بھی پوری کردی۔ میرے عماد کی چاندسی دلہن نیرہ احمد میرے گھر چلی آئی۔

وہ واقعی چاند سی پیاری تھی۔ شکل وصورت تو بھلی تھی ہی' طبیعت کی بھی سلجھی ہوئی بچی تھی۔ زندگی کی گاڑی پھر سے رواں ہوگئی۔ عماد کو بہت اچھی سی نوکری ملی تو اس کے اصرار پر میں نے استعفیٰ دے دیا۔

اب میں اور نیرہ گھر پر رہا کرتے تھے۔ اس دن عماد گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ دروازہ میں نے کھولا تھا۔ وہ مجھے سلام کرکے اندر چلا گیا۔ نیرہ کچن میں تھی۔ وہ سیدھا کچن میں چلا گیا۔ میں اپنے کمرے کی جانب جارہی تھی جب مجھے ان دونوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔

ایک لمحے کے لئے میرے قدم تھمے پھر میں لاؤنج سے اپنے کمرے میں آگئی۔

نجانے کیوں مجھے غصہ آیا تھا۔ وہ عماد جو گھر آکر میرے آگے پیچھے پروانوں کی طرح پھرتا تھا۔ وہ محض ایک لفظ بول کر مجھے نظر انداز کرتا گزر گیا۔ اسے جمعہ جمعہ آٹھ دن پہلے آئی ہوئی بیوی اس قدر عزیز ہوگئی تھی کہ اسے اپنی ماں کی خیریت دریافت کرنا بھی یاد نہ رہا۔

میں بیڈ پر بیٹھ کر ایک افسردگی کے عالم میں سوچے جارہی تھی جب وہ اجازت لے کر اندر چلا آیا۔

''کیا سوچ رہی ہے میری ماں؟'' وہ میرے پاؤں تھام کر بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں۔ آؤ بیٹھو!'' میں نے پیر سمیٹ کر خود پر قابو پایا۔

''امی۔ میں نے آفس سے ہفتے بھر کی چھٹی لی ہے۔ دراصل میں اور نیرہ گھومنے جارہے ہیں۔'' وہ بڑے خوشگوار موڈ میں بتا رہا تھا۔

میں ایک سکتے کے عالم میں رہ گئی۔ یہ وہی عماد تھا جو مجھ سے اجازت لئے بنا پڑوس میں بھی نہیں جاتا تھا اور وہ کتنے مزے سے مجھے ہفتہ بھر کے لئے جانے کا مژدہ سنا رہا

تھا۔ اس نے یا نیرہ نے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی تھی۔ ابھی میں کچھ کہنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ نیرہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ ساتھ وہ سموسے تل کر لائی تھی۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی عماد کی پوری توجہ اس کی جانب مرتکز ہوگئی تھی۔ اس نے نیرہ کے لئے کھسک کر جگہ بنائی اور وہ اس سے جڑ کر بیٹھ گئی' اب وہ مسلسل اسے جانے کے پروگرام کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے' مسکرا رہے تھے۔ منظر میں سب سے غیر اہم شئے شاید میری ذات تھی۔

''امی! یہ سموسے لیں نا۔'' اچانک ہی نیرہ کی توجہ میری جانب ہوئی۔ ''ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔''

''مجھے سموسے پسند نہیں۔'' نجانے کیوں میرا لہجہ خشک ہوگیا۔ ''اور عماد تو بالکل نہیں کھاتا۔ تمہیں بنانے سے پہلے پوچھ لینا چاہئے تھا۔''

نیرہ کا چہرہ سفید ہوا۔ وہ میرے غیر متوقع جواب سے خجل ہوگئی تھی۔

عماد نے جلدی سے سموسہ اٹھالیا۔

''ارے امی..... ! آپ کو نہیں پتا۔ میں تو کالج میں اتنے سموسے کھاتا تھا کہ لڑکوں نے میرا نام ہی مسٹر سموسہ رکھ دیا تھا۔''

نیرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ عماد بھی ہنسنے لگا۔ میں خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ عماد نے زندگی میں پہلی مرتبہ میری بات کی نفی کی تھی۔

وہ دونوں گھومنے گئے تو میں اپنی ذات کے سوالات کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ مجھے ان دونوں کا یوں جانا بالکل اچھا نہ لگا تھا۔ کیا تھا جو وہ پہلے مجھ سے اجازت لیتے پھر پروگرام بناتے۔ کیا تھا جو وہ جھوٹے منہ ہی سہی مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہتے۔ کیا میں اتنی ہی بے وقوف ہوں جو ان کے ساتھ چل دیتی؟

مجھے نیرہ کے خلاف اپنے دل میں پیدا ہونے والی کدورت کا احساس ہوا۔ مجھے

ایسا لگا کہ چوبیس برس تک میں نے جس باغ کی تیاری کا سامان کیا' جب اس نے تیار ہو کر جنت کی سی صورت اختیار کی تو کسی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے میری جنت سے نکال باہر کیا۔

میرے اندر دھواں سا بھرنے لگا۔ آگ بھڑک اٹھنے کا سامان ہونے لگا۔ وہ کل کی لڑکی میرے عماد کو مجھ سے جدا کر کے لے گئی تھی۔ میرے عماد نے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت تک نہ سمجھی تھی۔ وہ لوگ واپس لوٹے تو اندرونی خوشیوں سے ان کے چہرے جگمگا رہے تھے۔ عماد کو میں نے کبھی اس قدر خوش نہ دیکھا تھا۔ وہ بات بات پر قہقہہ لگاتا تھا اور نیرہ۔ اس کے چہرے سے نگاہ ہٹانا مشکل تھا۔ وہ حد درجہ حسین ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی ذات میں گم تھے۔

اور میں...... میں اپنی کیفیات سمجھنے سے یکسر قاصر تھی۔ میرا بیٹا' میرا آتی جاتی سانسوں کی واحد وجہ' میرا عماد خوش تھا اور میں اندر سے سلگ رہی تھی اور نیرہ جسے میں خود بڑی چاہتوں سے لے کر آئی تھی' اس کے لئے میرے دل میں روایتی ساسوں والی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ مجھے وہ لڑکی نہایت بری لگنے لگی۔ اس نے میرے عماد کو مجھ سے بے پروا کر دیا تھا۔

مجھے اس کا وجود ناگوار گزرنے لگا۔ یہ گھر میرا اور عماد کا تھا۔ یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے جیتے اور مرتے تھے۔ ہم دونوں کے خیالات محض ایک دوسرے کے لئے مخصوص تھے۔ ان خیالات میں کسی تیسرے فرد کا حصہ نہ تھا۔ اور اچانک ہی وہ ہمارے درمیان آ کر نہ صرف حصہ دار بن گئی تھی۔ بلکہ اس نے تو مجھے میرے حصے سے ہی محروم کر دیا تھا۔

اب اس کے اور عماد کے درمیان ''میں'' شاید کہیں نہ تھی۔

اب مجھے اس کی ہر بات قابل اعتراض نظر آنے لگی۔ عماد آفس جاتا تو اس وقت نیرہ سو رہی ہوتی تھی۔ میں عماد کو ناشتہ بنا کر دیتی تھی۔ میں نے اور عماد دونوں نے ہی کبھی اس کے اس معمول پر اعتراض نہ کیا تھا۔ لیکن اب میں اس بات پر غصہ ہونے لگی۔

''تم نیرہ سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ تمہیں ناشتہ بنا کر دیا کرے؟'' ایک صبح اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔ امی؟'' وہ مسکراتے ہوئے اخبار کے صفحات الٹنے لگا۔ ''وہ نیند پوری کر لیتی ہے اور مجھے آپ کی ہاتھ کی بنی چائے مل جاتی ہے۔''

''تعریف تو سارا دن تم نیرہ کے ہاتھ کی بنی چائے کی کرتے ہو۔'' میرا لہجہ معمول کے مطابق تھا۔ وہ میرا طنز نہ سمجھ سکا۔

''ارے اس کو تو میں مکھن پالش کرتا ہوں۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''ورنہ آپ کے ہاتھ کا مزہ اس کے ہاتھ میں کہاں؟''

میں اندر تک شانت ہوئی۔ میرا بیٹا اب تک میرے کھانوں کا دیوانہ تھا۔ میں عماد سے مزید کچھ نہ کہا لیکن نیرہ جب سو کر اٹھی تو میں نے اسے خاصا طویل لیکچر دیا۔

''ٹھیک ہے امی! جیسے آپ کہیں۔'' اس نے محض اتنا کہا تھا۔

دوسرے دن سے وہ عماد کو سو کر اٹھنے سے پیشتر ہی اٹھ کر باہر آ جاتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے ناشتہ بناتی۔ وہ آفس جانے لگتا تو اسے چھوڑنے نیچے سیڑھیوں تک جاتی اور جب وہ واپس آتی تو اس کے لب مسکرا رہے ہوتے تھے۔

اس نے مجھ سے میری یہ خوشی بھی چھین لی۔ اب میرا بیٹا گھر سے نکلتے ہوئے مجھے نہیں اسے دیکھتا تھا۔ واپس آ کر تو خیر اسے نیرہ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔

سارا وقت وہ نیرہ کی تعریفیں کرتا رہتا تھا۔

''نیرہ! تم بڑے کمال کی لڑکی ہو ارے یہ کام تم نے کتنا اچھا کیا ہے۔ فلاں وقت تم نے بہت اچھی بات کی تھی۔ تم کو دل جیتنے کا ہنر کس نے سکھایا؟''

اس کے اکثر فقرے میرے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ ہمارا فلیٹ دو کمروں پر مشتمل ایک مختصر سا گھر تھا اور پھر میرے کان لاشعوری طور پر ان کی باتوں کی طرف ہی لگے رہتے تھے۔ سو مجھے ان کی گفتگو سے اکثر واقفیت رہتی تھی۔

ان دنوں وہ مجھ سے بے حد نیاز ہو گیا تھا۔ سلام دعا کرتا تھا' میرا مزاج بھی پوچھتا تھا' ہنسی مذاق بھی کرتا تھا لیکن میں تو اس عماد کا موازنہ ہمہ وقت اس عماد سے کیا کرتی

تھی جو صرف میرا عماد تھا۔ میں جس کی روح میں اتری ہوئی تھی۔ جو میری خدمت کو عبادت کہا کرتا تھا۔

میں زیادہ دن رو نہ سکی۔ ایک دن آفس سے آ کر مجھے سلام کرتا ہوا اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا جب میں نے اسے آواز دی۔

''جی امی؟'' وہ میری جانب بڑھ آیا۔

''یہاں آؤ عماد!''

اسے میرا لہجہ تبدیل لگا۔ وہ فوراً ہی اندر آ گیا۔

''جی امی؟'' کہیے؟'' وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔

''تمہیں اب اتنی فرصت بھی نہیں میسر آتی کہ دو گھڑی ماں کے قریب بیٹھ جایا کرو۔؟'' میرا شکوہ بالآخر لبوں پر آ ہی گیا۔

وہ شرمندہ ہو گیا' میرے پیر دبانے لگا۔

''سوری امی! پچھلے کچھ دنوں سے شاید میں آپ کو وہ پہلی سی توجہ نہیں دے پایا۔ خیر میں آئندہ خیال رکھوں گا...... میری کوتاہی معاف کر دیں۔''

وہ گھنٹہ بھر میرے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ نیرہ کھانے کا پوچھنے آئی تو میں نے کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا۔ پھر چائے بھی ساتھ پی گئی۔

وہ دونوں اٹھ کر گئے تو میں خاصی مطمئن تھی۔ میرے بیٹے کی برین واشنگ اتنی آسان نہ تھی۔ اس کی رگ رگ میں اس کی ماں کی کٹھن ریاضت کی احسان مندی دوڑ رہی تھی۔ ایک تو کیا سو نیرائیں بھی اسے مجھ سے غافل نہ کر سکتی تھیں۔ عماد اب محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر نیرہ سے زیادہ مجھے توجہ دینے لگا۔ آفس جانے سے پہلے اور آنے کے بعد وہ نیرہ سے پہلے مجھے پوچھتا تھا۔ رات گئے تک وہ بیٹھا میرے پاؤں دباتا رہتا۔ مجھ سے زمانے بھر کی باتیں کرتا۔ میرا عماد میری ذرا سی سرزنش سے پھر سے میرا بن گیا تھا۔

میں اب خوش تھی' جہاں تک نیرہ کی بات تھی' وہ اپنے جذبات کا اظہار نہ کرتی

تھیں۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ جب عماد کی اس پر زیادہ توجہ مجھے اذیت دیتی ہے تو مجھ پر زیادہ وقت صرف کرنے سے نیرہ کے دل کو ٹھیس پہنچتی ہو گی۔ بہر طور مجھے اس کی پروا تھی نہ اس کے دل کی۔

وقت کچھ اور سرکا اور بازی ایک مرتبہ پھر پلٹنے لگی۔ نیرہ ماں بننے والی تھی۔ عماد کا بس نہ چلتا تھا وہ یہ خبر سن کر کیا کر ڈالے۔ وہ بے پناہ خوش تھا۔ نیرہ کی طبیعت خراب تھی' وہ پورا ہفتہ آفس نہ گیا۔ سارا سارا دن وہ اس کے سرہانے بیٹھا رہتا تھا کبھی اس کے لئے لیموں بناتا۔ کبھی گلوکوز گھولتا' کبھی اسے حلیم لا کر کھلاتا کبھی چنوں کی چاٹ۔

میں ایک مرتبہ پھر پس منظر بن گئی۔ نیرہ نے ایک بار پھر بازی جیت لی۔ اس موقع پر میں کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ میں عماد سے اس کی کم توجہی کی شکایت نہ بھی کر سکتی تھی۔

میں سارا سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی اور عماد اس کی دل جوئی میں لگا رہتا۔ میرے سر میں درد رہنے لگا۔ میرا بلڈ پریشر اکثر ہائی ہو جاتا تھا۔ لیکن عماد کو فی الحال میری پروا نہ تھی۔ وہ نیرہ کے لئے ایسے فکر مند رہتا تھا جیسے وہ دنیا کی پہلی عورت تھی' جو ایسے مسئلے کو فیس کر رہی ہو۔ ایک دن وہ حسب معمول آفس سے جلدی اٹھ آیا تو میں چیخ گئی۔

''عماد! تم آج پھر جلدی آ گئے؟'' میرا لہجہ تلخ تھا۔

''جی امی...... !نیرہ نے فون کیا تھا اس کا دل گھبرا رہا ہے۔''

''تم ریڈیو یا ٹی وی ہو جو اس کا دل بہلانے چلے آئے؟''

''امی؟'' اسے میرے لہجے نے ہراساں کر دیا۔

''عماد! یہ مرحلہ دنیا کی ہر عورت طے کرتی ہے۔ نیرہ کو احساس ہونا چاہئے کہ وہ تمہاری پیشہ وارانہ ذمہ داریوں میں حائل ہو رہی ہے۔ تمہاری ترقی میں دیر ہو سکتی ہے...... بلکہ تمہیں نوکری سے جواب بھی مل سکتا ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے امی!'' وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔

''بہر حال۔ مجھے یہ طریقہ پسند نہیں۔ تم نہ تو کوئی کھلونا ہو جو روز اس بچی کا جی

بہلانے چلے آتے ہو اور نہ ہی کوئی دائی یا ڈاکٹر ہو جو اس کے "مرض" کی شدت میں کمی کر سکو۔ یہ وقت ہر عورت کو فیس کرنا ہی ہوتا ہے۔ مردوں کو ان باتوں کو اتنا سیریس نہیں لینا چاہئے۔"

یہ ایک بھرپور لیکچر تھا۔ جو اندر لیٹی نیرہ نے بھی سنا تھا۔ عماد چپ چاپ سر جھکائے اندر چلا گیا تھا اور کچھ دیر بعد تیار ہو کر گھر سے باہر۔ نیرہ پھر کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔

یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ وہ دونوں بے حد محتاط ہو گئے۔ نیرہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔

اب اسے مکمل طور پر احساس ہو چکا تھا کہ میں عماد کے معاملے میں کتنی پکی ہوں۔ اب وہ دونوں میرے سامنے ایک دوسرے سے وہ پہلی سی لگاوٹ کا مظاہرہ نہ کرتے تھے۔

عاشر پیدا ہوا تو کچھ عرصے کے لئے کے ہر قسم کی کشیدگی کا خاتمہ ہو گیا۔ عماد خوش تھا۔ نیرہ بے پناہ خوش تھی اور میں بھی خوش تھی۔ ہمارا گھر پھر سے وہی گھر بن گیا جہاں نیرہ نئی آئی تھی۔ عاشر کے آ جانے سے جیسے وہ وقت پلٹ کر آ گیا تھا۔

نیرہ بیٹے کی ماں بن کر بے حد مصروف ہو گئی تھی۔ وہ عاشر کے کاموں میں سارا وقت صرف کر دیتی تھی۔ میں اس کو دیکھتی تو مجھے اپنا وقت یاد آ جاتا تھا۔ عاشر ننھے عماد کا روپ دھار لیتا تھا۔

"نیرہ۔ جانتی ہو عماد بلکہ ایسا ہی تھا۔ کبھی کبھی مجھے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عماد کا بچپن پھر سے لوٹ آیا ہے۔" ایک دن میں نے اسے بتایا

"آپ تو بہت چھوٹی سی ہوں گی امی۔" اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"ہاں۔ محض اکیس برس کی!" میری آنکھیں دھندلائیں۔

"آپ تو اب بھی تیس سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔" وہ شرارت سے ہنسی۔ "سچ سچ بتائیں امی......! کوئی اچھا سا رشتہ آ جائے تو انکار تو نہ کریں گی؟"

"نیرہ......" میں ایک دم پھٹ پڑی۔ "تمہیں علم ہونا چاہئے کہ تم کس سے کیا کہہ رہی ہو۔ بدتمیزی اور مذاق میں حد فاصل قائم رکھنا سیکھو...... یا شاید تم مجھے اس گھر سے نکالنے کے طریقوں پر غور کرتی رہتی ہو؟"

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے شاید اتنے شدید ردعمل کی توقع نہ تھی لیکن میرے دماغ کی شریانوں میں خون کھول رہا تھا۔ میں نے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ایک طوفان اٹھا دیا۔ عماد آیا تو اسے بھی بے نقط سنائیں۔

نیرہ اور عماد نے مجھ سے خصوصی معافی مانگی۔ میری منتیں کیں تب کہیں جا کر میرا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ عماد نے بھی اس بات کا نوٹس لیا تھا۔ وہ کئی دن نیرہ سے ناراض رہا۔ نیرہ بالکل مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس نے تیار ہونا' ہنسنا بولنا' بے حد کم کر دیا تھا۔ اب اس میں وہ پہلی سی چمک نہ رہی تھی' میں قدرے مطمئن تھی۔

بیوی زیادہ چمکے تو شوہر کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اسے دوسرے رشتے واضح نظر نہیں آتے۔

عماد کی توجہ اس پر کم ہوئی تو وہ میری توجہ کی زد میں آ گئی۔ اب میں اسے اس کی جگہ پر رکھنا چاہتی تھی۔ میں اسے زیادہ سے زیادہ گھر کے کاموں میں لگائے رکھتی۔ اپنا کمرہ بار بار صاف کرواتی۔ اپنے کپڑے دو دو مرتبہ دھلواتی۔

شاید میں لاشعوری طور پر اس سے پچھلے دنوں کا حساب مانگ رہی تھی۔ وہ ایک آدھ بار جھنجھلائی تو میں نے عماد سے اس کی بدتمیزی کی شکایت کی۔ عماد آج بھی میری بات ٹالنا گناہ جانتا تھا۔

ایک دن عماد کے جانے کے بعد نیرہ نے عاشر کو سلایا اور میرے کمرے میں چلی آئی۔

"امی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اس کے انداز غیر معمولی تھے۔

"جلدی کہو۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" میرا لہجہ حسب معمول خشک تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ میں اور عماد اس گھر میں شفٹ ہو جائیں جو عماد کو کمپنی والے دے رہے ہیں۔"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"کیا مطلب؟ اور میرا کیا ہوگا؟"

"ہم روز آپ سے ملنے آئیں گے۔"

"عماد راضی ہے؟"

وہ آپ کی مرضی کے پابند ہیں۔"

"پھر؟ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں خوش ہوگئی۔

"آپ عماد کو اجازت دیں۔ بخوشی!"

"تم اپنا بیٹا میرے مانگنے سے مجھے دو گی؟"

وہ خاموش ہو کر لب کاٹنے لگی۔

"میرے بیٹے پر آپ کا اتنا حق نہیں کہ آپ مجھ سے اسے مانگیں۔ میں آپ کے بیٹے کی بیوی ہوں۔" وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔

"بیوی اور ماں کے حقوق کا موازنہ کیا ہے کبھی؟" میں نے نخوت سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔ کبھی نہیں کیا۔ میں محض ایک بیوی کے حقوق کا مطالبہ کرتی رہی ہوں اور جو کچھ چاہتی ہوں وہ میرا جائز حق ہے۔"

"کیا چاہتی ہو؟ ایک ماں سے اس کا بیٹا جدا کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔ اپنے لئے ایک علیحدہ گھر چاہتی ہوں۔ جہاں میرے لئے ذہنی سکون ہو۔ جہاں میں اپنی مرضی کے مطابق جی سکوں۔ جہاں میرا شوہر مجھ سے ویسی ہی محبت کرے جیسی وہ کرنا چاہتا ہو۔"

"میرا درد سر نہیں ہے۔" میں نے بے نیازی سے منہ پھیر لیا۔

"آپ کو بخوشی اجازت دینی چاہئے امی! ورنہ آپ کو دلی تکلیف ہوگی۔"

"تم مجھے چیلنج کر رہی ہو؟ تم عماد کو مجھ سے کسی طور جدا نہیں کر سکتیں۔ کوشش کر دیکھو۔"

وہ مجھے ایک گہری نظر سے دیکھ کر مڑ گئی۔

عماد آیا تو میں نے اسے آواز دے کر پہلے اپنے پاس بلوا لیا۔

"تمہیں کمپنی گھر دے رہی ہے؟" میں نے بنا کسی تمہید کے پوچھا تھا۔

"جی......؟" وہ چور سا بن گیا۔ "جی امی۔"

"تم مجھے تنہا چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟" اس لمحے میرے لہجے میں بے یقینی بولنے لگی۔

"نہیں امی!" اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر پست آواز میں بولا۔ "اگر آپ نہیں چاہیں گی تو کبھی نہیں۔"

"ہوں!" میں مطمئن ہوگئی۔ "جا سکتے ہو......"

میں بے حد پرسکون ہوگئی تھی۔ محبت کی جس ڈور سے میں نے اپنے بیٹے کے دل کو باندھا تھا وہ اتنی کمزور تو نہ تھی کہ یوں ٹوٹ جاتی۔ ماں بیٹے کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ دنیا کا سب سے کمزور رشتہ ہے۔

شام کو نیرہ اپنا بیگ اور عاشر کو لے کر گھر سے چلی گئی۔ شاید عماد نے اس پر اپنا نقطہ نگاہ نظر واضح کر دیا تھا۔

میں بے پناہ خوش ہوئی۔ کھیل میں جیت میری ہوئی تھی۔ نیرہ سمجھتی تھی کہ اس کی دو روزہ محبت اور خدمت میری پچیس سالہ ریاضت پر غالب آ جائے گی۔ ایسا ناممکن تھا۔ نیرہ کو گئے مہینہ دو مہینے اور پھر چھ ماہ گزر گئے۔ عماد ایک عجب کشمکش کا شکار تھا۔ نیرہ اس گھر میں واپس آنے کے لئے تیار نہ تھی۔ میں کسی طور پر اسے علیحدہ ہونے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ میں نے اپنے بیٹے کو اس کشمکش سے باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز میں نے اس سے بات کی۔

"عماد......! جانتے ہو ایک ماں کا قرض کیا ہوتا ہے؟" وہ بیڈ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

"جانتے ہو عماد! تمہاری خاطر میں نے زندگی کس طرح گزاری ہے؟"

"جی امی! جانتا ہوں۔"

"جیسے کوئی جوگ لے کر بھری دنیا چھوڑ دے۔ کسی صحرا میں جا بسے۔"

"میرا رواں رواں آپ کا مقروض ہے امی!"

"اگر میں تم سے کچھ مانگوں تو؟"

"مانگ کر دیکھیں۔ جان سے زیادہ تو نہیں مانگی گی نا؟" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"نیرہ کو طلاق دے دو۔"

"کیا؟"

وہ اچھل کر بیٹھ گیا اور بڑی بے یقینی سے میرا چہرہ تک دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس سے اس کی جان سے بڑھ کر کچھ طلب کیا ہے۔

"میں چاہتی ہوں عماد! تم ایک خوشی سے بھرپور' مطمئن زندگی گزارو۔ نیرہ وہ لڑکی نہیں جو تمہیں ایسی زندگی دے سکے۔ ماں اپنے بیٹے کے لئے غلط نہیں چاہے گی۔ مجھ پر بھروسہ کر کے اسے طلاق دے دو۔ میری دعاؤں سے تمہاری زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔ دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ یہی میری خواہش بھی ہے اور میرا حکم بھی۔"

میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

چند روز بعد وہ ٹوٹا ٹوٹا' بکھرا بکھرا میرے پاس آیا تھا۔

"امی۔ میں نے نیرہ کو طلاق بھیج دی ہے۔"

زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی لیکن سب کچھ پہلے جیسا نہ ہو سکا۔ میں نے عماد کی دوسری شادی کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے درخواست کی کہ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا لیکن میرا عماد اندر سے بدل گیا تھا۔ اس کی تمام خوشی' شوخی' شرارت رخصت ہو گئی تھی۔ میں نے ایک دو مرتبہ عاشر کو لے آنے کی بات کی تو اس نے انکار کر دیا۔

"وہ ماں سے بچھڑ کر بیمار ہو جائے گا امی...... پلیز!"

میں بھی اتنی ہمت نہ کر سکی کہ ایک ماں سے زبردستی اس کا بچہ چھین لوں۔

پھر ایک دن عماد نے مجھے بتایا کہ وہ دو سالہ کورس کے لئے باہر جا رہا ہے۔

"کمپنی نے اس مقصد کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔ میرے کیریئر کا سوال ہے امی۔ امید ہے آپ مجھے نہیں روکیں گی۔"

اس نے خبر سنا کر مجھ سے کہا تھا اور اس بات کے بعد اسے روکنا بے سود تھا۔ اس کا کیریئر عروج پر دیکھنا تو میری اپنی بہت بڑی خواہش تھی۔

"دو سال کی تو بات ہے۔" میں نے خود کو سمجھایا تھا۔ "زندگی پلک جھپکتے گزر گئی ہے۔ بھلا چند ماہ و سال کیا معنی رکھتے ہیں؟"

عماد چلا گیا۔ میں تنہا رہ گئی۔ شاید تنہائی ازل سے میرا مقدر قرار پائی تھی۔ میں اس کے پلٹ آنے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ نہیں آیا۔

دو سال گزرے۔ پھر چار اور پھر چھ سال گزر گئے۔ عماد کے خطوط آتے تھے۔ اس نے وہاں شادی کر لی تھی۔ اس کی بیوی یہاں آنے پر تیار نہ تھی لیکن عماد کو امید تھی کہ کبھی نہ کبھی وہ راضی ہو جائے گی۔ تب تک کے لئے اس نے مجھے اچھی امیدوں کے تحفے بھیجے تھے۔

میں جانتی تھی میرا عماد اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ کی جدائی بخش دی تھی۔

میں بالکل تنہا رہ گئی۔ زندگی میں کوئی مقصد نہ رہا تھا۔ میں نے ایک اسکول کھول لیا۔ ذہن قدرے بٹ گیا لیکن اکثر تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی تھی۔

تب ایک روز ڈاک سے مجھے نیرہ کا خط موصول ہوا۔ وہ خط ایک نئی زندگی کی نوید تھی۔ اس لکھا تھا۔

امی جان

السلام علیکم

امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ خدا سے آپ کی خیریت اور لمبی عمر کی دعا مانگتی ہوں۔

عماد نے طلاق دینے سے قبل مجھ سے پوچھا تھا کہ میں اسے ایک دوست کی حیثیت سے درست مشورہ دوں کہ اسے کیا کرنا چاہئے؟

میں نے کہا بیوی دنیا ہے اور ماں آخرت اور ایک مخلص دوست کبھی بھی آخرت کے مقابلے میں دنیا کا سودا کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے مجھے طلاق دے دی۔ اس وقت مجھے

آپ سے بے پناہ شکوہ تھا۔ آپ کے خلاف میرے دل میں حد درجہ کدورت تھی۔

لیکن امی جان! مجھے اعتراف ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرا میرے دل سے سارے شکوے جاتے رہے۔ ہر طرح کی کدورت مٹنے لگی۔ سارے غبار بیٹھ گئے۔

کیونکہ میں ایک ماں ہوں اور زندگی اسی طور گزار رہی ہوں جیسے کبھی آپ نے گزاری تھی۔

امی جان! آپ کے جذبات اور احساسات کسی الہام کی مانند میرے اوپر نازل ہو رہے ہیں۔ کبھی میں تصور کی آنکھ سے پچھلے مناظر دیکھتی ہوں تو خود کو آپ کی جگہ اور عاشر کو عماد کی جگہ پاتی ہوں۔ لیکن ایک اعتراف میں اور کرتی ہوں۔ میں کبھی بھی بلقیس بیگم بن کر کسی نیرہ کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہوں گی۔ ہر چند کہ مجھے عاشر سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ آپ نے عماد سے کی۔

خدا نے ماں کا حق' ہر دوسرے شخص کے حق میں زیادہ رکھا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں اس حق کا احساس اولاد بن کر نہیں' خود ماں بن کر ہوتا ہے۔ ایک ماں اپنی اولاد کے لئے دن رات ریاضت کرتی ہے' اپنی ہستی خاک کر ڈالتی ہے' خواہشات فنا کر دیتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ خدا کے دیے حق سے ناجائز فائدے اٹھانا چاہتی ہے۔ اپنی قربانیوں کا خراج مانگتی ہے۔ گزشتہ محبت کو حالیہ انا میں تبدیل کر کے اپنی ہی اولاد کی خوشیاں تباہ کر دیتی ہے۔

مجھے اس وقت سے خوف آتا ہے جب میں عاشر سے اپنی ریاضتوں کا صلہ طلب کروں۔ میں نفسیاتی مریضہ بن رہی ہوں۔ یہ خوف میری ہستی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ لیکن میں اس خواہش سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتی کہ عاشر دنیا میں سب سے زیادہ مجھے چاہے۔ میرا مان کرے۔

اسی لئے امی جان میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں دوسری شادی کر رہی ہوں۔ ایک ایسے شخص سے جس کے تین بچے ہیں اور مزید بچوں کی اسے خواہش نہیں ہے۔

عاشر کو...... میں آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ آپ اس کی بہترین طریقے پر پرورش کر سکتی ہیں۔ اسے بہترین تربیت سے آراستہ کر کے ایک بہترین

انسان بنا سکتی ہیں۔ عماد کو میں نے ایسا ہی پایا تھا۔

جہاں تک عاشر کے مستقبل کا سوال ہے' مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اب آپ کبھی بھی اپنی غلطی دہرانے کی ہمت نہیں کریں گی۔ عماد کے بعد عاشر کو کھونا آپ کے لئے ناممکن ہو گا۔ عاشر گیارہ برس کا ہے۔ عام بچوں سے بالکل مختلف' بہت ذہین اور سنجیدہ طبیعت کا مالک ہے۔ شاید وقت اور حالات نے اسے ایسا بنایا ہے۔ یہ آپ کے پاس آنے اور آپ کے ساتھ رہنے پر دل سے راضی ہے ورنہ میں اکیلے یہ فیصلہ کبھی نہ کر پاتی۔

شاید اس کے دل میں بھی کہیں یہ امید پوشیدہ ہے کہ اس طرح یہ اپنے باپ سے کبھی مل پائے گا۔

میرا دل آپ کی جانب سے صاف ہے۔ یقیناً آپ بھی میری کوتاہیوں پر مجھے معاف کر چکی ہوں گی۔ عاشر کل صبح دس بجے آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ میرے عاشر کو اپنے عماد جیسا بنایئے گا۔

فقط

نیرہ احمد

میرے آنسو میرے رخسار بھگو رہے تھے۔ میں نے کتنی ہی بار اس تحریر کو پڑھا اور پھر چوم کر اپنے سرہانے رکھ دیا۔

اگلی صبح میں بہت سویرے بیدار ہوئی تھی۔ نماز پڑھ کر میں کچن میں چلی آئی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے عاشر کو وہ سب چیزیں بہت پسند ہوں گی جو میرا عماد شوق سے کھاتا تھا۔

''میرا بیٹا...... میرا لال......'' میں کام کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ ''میں تجھے بڑی محبتوں سے پالوں گی۔ تیرے لئے اپنی زندگی وقف کر دوں گی۔ تو بہت بڑا آدمی بنے گا...... پھر میں تیرے لئے چاند سی دلہن لاؤں گی......''

جنت' دوزخ

''اور جس بندے نے دنیا میں سکھ ہی سکھ دیکھے ہوں گے اور ان نعمتوں پر خدا کا شکر بجا لایا ہوگا اسے خدا بالوں سے پکڑ کر دوزخ میں ایک غوطہ دے گا' پھر نکال کر پوچھے گا کہ ''اے ابن آدم! بتا تو نے کبھی کوئی سکھ یا آرام پایا؟'' وہ کہے گا ''اے پروردگار! کبھی نہیں...... ہمیشہ سے اسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا ہوں......''

نعیمہ نے چھری میز پر رکھی اور ماتھے پر آیا پسینہ دوپٹے کے پلو سے پونچھنے لگی۔ گرمی سے دم نکلا جا رہا تھا۔ پلازا کی لائٹ پچھلے تین گھنٹے سے غائب تھی۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ ہو رہا تھا۔ جن علاقوں میں لائٹ موجود تھی وہاں کی ایک مسجد سے خطبہ پڑھتے مولوی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

نعیمہ نے سر پر پاؤ بھر مہندی تھوپی ہوئی تھی اور اب خود کو کوس رہی تھی کہ مہندی لگانے کے لئے جمعہ کا مبارک دن ہی رہ گیا تھا؟

''اور جس بندے نے دنیا میں رنج' پریشانی اور دکھوں کا مقابلہ کیا ہوگا اسے اس کا پروردگار جنت میں ایک غوطہ دے گا اور پھر پوچھے گا۔ ''اے میرے بندے بتا' کبھی تو کسی مصیبت میں مبتلا ہوا؟'' وہ کہے گا ''نہیں میرے پروردگار! ہمیشہ سے اپنی آسائشوں میں ہوں...... کبھی کوئی دکھ چھو کر بھی نہیں گزرا۔'' ''میری کم بختی!'' اس نے خود پر دانت پیسے' ''مہندی نہ لگائی ہوتی تو کپڑے بدل کر جمعہ کی نماز تو پڑھ لیتی...... اب نجانے کس وقت لائٹ آئے' کب پانی ٹینک میں چڑھے تو کب میں نہاؤں گی...... جمعہ کے دن کی رحمت سے بھی محروم رہی۔ خدا ان بجلی والوں سے سمجھے...... اتنا اتنا بل وصول کر کے بھی ان کے پیٹ

نہیں بھرتے۔ کھوٹی نیتوں کا کھوٹا پھل...... سدا ان کے کھمبوں میں خرابی ہی رہتی ہے...... بھگتان ہم غریب بھگتتے ہیں۔''

وہ دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی تیار کر رہی تھی۔ تینوں بچے چھوٹی چھوٹی نیکریں پہن کر گھر بھر میں ادھم مچا رہے تھے۔ گرمی اس قدر تھی کہ دیواریں بھاپ اگلتی محسوس ہوتی تھیں۔ نعیمہ نے بچوں کو اسکول سے لوٹنے پر انہیں محض نیکریں ہی پہنا دی تھیں۔ اس امید پر کہ لائٹ آنے پر نہلا کر کپڑے پہنائے گی۔ خود اس نے صبح اٹھتے ہی' رات گھول کر رکھی ہوئی مہندی' بالوں میں لگائی تھی۔ اب گرمی کی شدت سے مہندی کا پانی بہہ بہہ کر اس کا چہرہ بھی گل و گلزار کر رہا تھا۔ کاٹن کی قمیض پسینے کی زیادتی سے گیلی ہو رہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے اس کا کام کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک نہ اس نے ٹھیک طرح سے گھر صاف کیا تھا' نہ ہی کچن میں بحالی کی کوئی صورت تھی۔ لائٹ نہیں تھی تو پانی بھی نہیں تھا صبح کے جھوٹے برتن یونہی سنک میں بھرے ہوئے تھے جن پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں اب اکتا کر اندر کمروں کا رخ کر رہی تھیں۔ چولہے گندے ہو رہے تھے اور ان میں ماچس کی جلی ہوئی تیلیوں کا ڈھیر تھا' کاؤنٹر داغ دھبوں سے اٹے ہوئے تھے۔

نعیمہ نے سبزی تو کاٹ لی تھی لیکن اب اسے پکانے کے لئے کچن میں گھسنے کا جی نہ کرتا تھا۔ کچن گندا تھا اور مکھیوں کے غول کے غول وہاں دعوت شیراز اڑانے میں مشغول تھے۔ اس پر گرمی کی شدت سے بے حال ہوتی سانسیں۔

نعیمہ جی بھر کر۔ ای۔ ایس۔ سی والوں کو کوستی رہی۔ بچوں کو اب بھوک ستانے لگی تھی۔ وہ بہانے سے آپس میں لڑ جھگڑ کر رو رہے تھے۔

''ارے یہ دنیا کے دھندے تو یہیں رہ جائیں گے لوگو...... ملک الموت سامنے آ کھڑا ہو تو تم اپنے بچوں کو بھی بھول بھال کر اس کے ساتھ چل دو گے...... پھر بتاؤ کیا لے جاؤ گے اپنے ساتھ؟ اولاد؟ دولت؟ یہ دنیاوی مصروفیت؟ جو ساتھ لے کر جاؤ گے اس کی تیاری کر لو لوگو......''

نعیمہ جزبز ہوئی۔ مولوی تو سیدھا اسی کو جتا رہا تھا۔ اس نے بے حد بے زاری سے اپنے چھوٹے سے فلیٹ پر بھرپور نگاہ دوڑائی۔ یہاں سے وہاں تک سب کچھ الٹا تھا۔ کچھ بھی

ایسا نہ تھا جو نظر اور دل کو تسلی دیتا۔

''ایسا مبارک دن اور ایسی نحوست کے ساتھ گزارا جائے!'' اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا ''صبح سے لائٹ کی آس میں بیٹھی رہی۔ کچھ ذکر اذکار ہی کر لیتی۔ ہائے نعیمہ! تیرا کیا بنے گا؟ کیا لے جائے گی اپنے ساتھ؟''

پھر وہ بہت ہمت کر کے اٹھی اور کچن میں جا گھسی...... بجلی اور پانی نہ تھے۔ غنیمت تھا کہ گیس آ رہی تھی۔ اس نے کونے میں دھرے بڑے سے کین سے پانی نکالا اور پتیلی مانجھنے لگی۔ گھر چھوٹا تھا اور کچن بہت چھوٹا۔ ضرورت کے چند برتن رکھنے کی گنجائش تھی' ہر بار انہیں دھو کر کام چلانا پڑتا تھا۔ نعیمہ نے پتیلی دھو کر چولہے پر رکھی اور سبزی پکانے لگی۔''

''امی......'' سب سے چھوٹا والا آنسوؤں سے چہرہ بھرے اس کی ٹانگوں سے آلپٹا ''امی...... کھانا دو اب مجھے بھوک لگی ہے۔''

''اچھا میرے چاند...... بس ابھی دیتی ہوں......'' نعیمہ نے اسے چمکارا۔

''میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے......'' وہ چلایا

نعیمہ نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا پھر ایک شیلف سے بسکٹ کا ڈبہ نکال کر اسے تھما دیا ''لو یہ کھاؤ میں ذرا سی دیر میں کھانا دیتی ہوں......''

بچہ بسکٹ پا کر اچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔ نعیمہ نے دوسرے چولہے پر توا رکھ دیا اور ساتھ ہی ساتھ روٹیاں بھی پکانے لگی۔ اس کے کانوں میں خطبے کے الفاظ گونج رہے تھے۔

اسے خود پر اور ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اس وقت اسے جائے نماز پر ہونا چاہئے تھا۔

''کیا لے جاؤ گے اپنے ساتھ؟ اولاد؟ دولت؟ دنیاوی مصروفیت؟''

وہ تاسف میں گھری روٹی اور سالن ساتھ ساتھ تیار کرتی رہی۔ آدھے گھنٹے میں اس نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ کچن کے باہر پڑی چھوٹی سی گول میز پر کھانا رکھ کر اس نے بچوں کو آواز لگائی۔ وہ تینوں بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے۔ اچھلتے کودتے چلے آئے۔ ابھی نعیمہ ان کی پلیٹوں میں سالن ڈال ہی رہی تھی کہ بجلی آ گئی۔

بچوں نے خوشی سے نعرے بلند کئے۔ نعیمہ کے لبوں پر خوشی سے بھرپور مسکان دوڑ گئی۔ اس نے با آواز بلند خدا کا شکر ادا کیا اور پنکھے چلا دیئے۔ بچے کھانا کھانے میں مشغول

ہو گئے۔ نعیمہ بکھرا ہوا گھر سمیٹنے لگی۔ دو چھوٹے بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ ڈائننگ...... اسے زیادہ دیر نہ لگی' جب تک بچوں نے کھانا کھایا وہ گھر کی اشیاء قرینے سے جگہوں پر پہنچا چکی تھی۔ جھاڑو پونچھا تو کام والی ماسی صبح ہی کر گئی تھی۔

مسجدوں میں اب نماز کے بعد درود و سلام ہو رہا تھا۔ نعیمہ نے نل کھول کر چیک کیا۔ پانی بھی آ رہا تھا۔ جی ہی جی میں شکر بجا لاتے ہوئے اس نے بچوں کو باتھ روم میں دھکیلا اور خود کچن میں چلی آئی۔ جلدی جلدی برتن دھو کر جگہوں پر رکھے' کاؤنٹر اور چولہے صاف کئے اور فرش پر وائپر پھیر کر باہر نکل آئی۔ ننگ دھڑنگ بچے نہا کر باہر آ چکے تھے۔ اور صوفوں پر اچھل رہے تھے۔

''کم بختو......'' اس نے سب کو ایک ایک جھانپڑ رسید کیا ''ابھی گھر سمیٹا ہے میں نے...... تم پھر حشر نشر کر دو...... چلو کپڑے پہن کر لیٹو تھوڑی دیر کے لئے......''

بچوں کو لباس پہنا کر اس نے ان کو بیڈ روم میں بند کیا اور خود اپنا ایک جوڑا نکال کر نہانے کے لئے گھس گئی۔ بالوں سے مہندی صاف کرتے کرتے اسے نہانے میں ہی خاصی دیر لگ گئی تھی۔

نہا دھو کر' باتھ روم صاف ستھرا کر کے جب وہ برآمد ہوئی تو گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گیلے بال جھٹکتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ تینوں بستر پر آڑے ترچھے لیٹے بے خبر سو رہے تھے۔

نعیمہ کے جی کو مکمل تسلی اور بھرپور سکون اور فراغت کا احساس ہوا۔ صبح سے جس ذہنی تھکن اور عجیب ٹینشن سے نبرد آزما تھی' اس سے گلوخلاصی ہوئی۔ اسے بھوک کا احساس ہوا۔ گھر میں پھیلی ہوئی کھانے کی خوشبو اسے اب محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ کچن میں پلٹ آئی۔ صاف ستھرا کچن اس کی نگاہ کو ڈھیر سکون بخش گیا اس نے اپنے لئے کھانا نکالا اور باہر پڑی میز پر آ بیٹھی۔

گھر اب ''گھر'' لگ رہا تھا۔ پنکھے چل جانے پر گرمی اپنے پر سمیٹ کر بالکونیوں میں جا نکلی تھی۔ گھر میں ٹھنڈک' سکون اور شانتی کا راج تھا۔

نعیمہ نے کھانا کھا کر ایک مطمئن ڈکار لی۔ پھر وہ اٹھی اور جھوٹے برتن کچن میں

رکھ کر کمرے میں چلی آئی۔ اے۔ سی آن کر کے وہ کچھ دیر کے لئے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کا وجود ڈھیلا ڈھیلا اور بے جان سا ہونے لگا تھا۔ بالوں سے مہندی نکل گئی تھی تو ذہن کو ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔ اسے غنودگی نے آن گھیرا۔ اس نے ایک نگاہ تین بجاتی گھڑی پر ڈالی۔ ظہر کی نماز کے لئے ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ عصر تک ذکر اذکار بھی کر سکتی تھی۔ عصر کے وقت اسے بچوں کو جگا کر سیپارہ پڑھنے کے لئے مسجد بھی بھیجنا تھا جہاں مولانا صاحب عصر کی نماز کے بعد بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔

نعیمہ نے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ اے۔ سی کی کولنگ سے کمرہ ٹھنڈا ہو کر جنت کا سا مزہ دے رہا تھا۔ پردوں سے چھنتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی سے ماحول بے حد پرسکون اور خوابناک لگ رہا تھا۔ گلدان میں سجے نقلی پھول پنکھے کی ہوا سے ایسی مانوس سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے جو نیند لانے میں بے حد معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

نعیمہ کو نماز یاد آئی۔ پھر اس کی آنکھوں کا بوجھل پن بڑھنے لگا۔ دو گھنٹے بعد اسے بچوں کو جگا کر مدرسہ بھیجنا تھا۔ دن بھر کی کوفت کے بعد آرام کے لئے اس کے پاس محض دو گھنٹے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کمرے میں جلتا ہوا لیمپ گل کر دیا اور کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے مدہوش ہوتے ہوئے ذہن میں دور کہیں مولوی کی آواز گونج رہی تھی۔

''اور بندہ کہے گا۔ ''نہیں میرے پروردگار! ہمیشہ سے اپنی آسائشوں میں ہوں!''

خدمت

اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے کمرے کا ذرا ذرا سا جائزہ لیا پھر خود کو مکمل طور پر تنہا پا کر سکون کا گہرا سانس لے کر' گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ رگ وپے میں گویا سکھ اور شانتی کا سمندر رواں تھا۔ خوشی اور فراغت کا احساس ایسا زور آور تھا کہ آنکھیں موند کر' لمبی تان کر سونے کا جی چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیر کر بستر کی ملائمت کو محسوس کیا۔ کمر پر زور ڈال کر تکیوں کے گداز کا اندازہ کیا۔ سر اٹھا کر سجی ہوئی خوبصورت چھت ملاحظہ کی۔ اپنے گرد گھیرا ڈالے' مہکتی ہوئی' گلاب کے پھولوں کی لڑیوں سے چھیڑ چھاڑ کی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ یکا یک ہی کوئی خیال آجانے پر اس نے ہتھیلی منہ پر رکھ کر ہنسی کا رستہ روکا۔

بھلا کوئی دیکھ سن لیتا تو کیا سوچتا؟

یہ کہ دلہن بیگم کو شادی کی خوشی اس قدر ہے کہ اکیلے میں بھی کھلکھلائے جاتی ہیں!

یا یہ کہ ارمانوں بھری اس رات کا انہیں دولہے میاں سے زیادہ انتظار تھا! یا یہ کہ تین کمروں کے اپارٹمنٹ سے دس کمروں کے وسیع وعریض بنگلے میں آجانے والی بے پناہ خوشی اس سے ہضم نہیں ہو پائی اور وہ کم ظرفوں کی طرح کھی کھی کر کے تھوڑی سی خوشی باہر چھلکا رہی ہے۔

کوئی اسے یوں ہنستے مسکراتے دیکھ لیتا تو اس طرح کا کوئی بھی اندازہ لگانے میں حق بجانب ہوتا۔ بھلا حجلۂ عروسی میں اپنے دولہا کا انتظار کرتی ہوئی کوئی لڑکی ایسے قہقہہ مار کر کب ہنستی ہے؟ آس پاس چنچل شوخ لڑکیوں کا میلہ لگا ہو تب تو ممکن ہے کہ کسی دل دھڑکا دینے والی بات پر شرمیلی مسکان لبوں کو چھیڑ جائے۔ ورنہ تو لڑکی اپنوں سے تازہ تازہ جدائی پر ایسے گلاب کی مانند لگتی ہے جو کھل کر خوشبو تو دے رہا ہو لیکن اس کے سینے پر داغ بھی نمایاں نظر

آتا ہو۔ دلہن کا گلاب چہرہ بھی آنے والے جادوئی لمحوں کے احساس سے لو تو دیتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں دکھ کی گلابی نمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہی دلہن کا حسن ہے۔

اس نے اپنے چھوٹے سے سنہری پرس کا منہ کھولا اور ننھا منا سا گول آئینہ نکال کر اپنا میک اپ چیک کرنے لگی۔ سب کچھ بالکل ٹھیک تھا! آنکھوں کا کاجل اپنی حدوں میں مسکرا رہا تھا۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک بھی بالکل تازہ تھی۔ چہرے پر خوشی کی چمک صاف محسوس ہوتی تھی۔

اس نے مرر واپس پرس میں رکھ دیا اور پھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ بھلا کیوں اداس ہوتی ؟ اپنی رخصتی کے موقعہ پر جھوٹے آنسو کیوں بہاتی؟ بھائیوں کا مشترکہ گھر چھوڑتے ہوئے اسے اپنی ماں یاد آئی بھی تھی تو اس نے چشم تصور سے ماں کی روح کو شانت ہو کر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

اسے بھلا کیوں رونا آتا؟ وہ پرائے گھر سے اپنے گھر جا رہی تھی۔ بھابیوں کا گھر پرایا ہی تو ہوتا ہے۔ اور ایسا گھر جہاں نہ باپ کے مضبوط سائبان کا احساس ہو نہ ماں کی پر شفقت و مہربان گود دستیاب ہو۔ جی ہلکا کرنے کے لئے جہاں واش روم کا سنک ہی میسر آتا ہو کسی ہمدرد و ہم زباں کا کاندھا نہ ملے۔

ہاں! وہ ہنس رہی تھی۔ بے پایاں خوشی اور سکون کا احساس اسے گدگدا رہا تھا۔ ایسا احساس جس سے تیس سال کی عمر میں وہ پہلی بار روشناس ہوئی تھی! یہ احساس کہ وہ "اپنے" گھر میں تھی' یہ احساس کہ بالآخر بھی لڑکیوں کی طرح اس کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ یہ احساس کہ اسے پسند کیا گیا تھا۔ اسے آخر کار ایک باعزت گھر کی بہو بن جانے کی نوید دی گئی تھی۔ کتنا کٹھن سفر تھا اس کا' آگے کے کتنے دریا پار کر لیے تھے اس نے۔ بیس برس سے تیس برس کا ہو جانا کوئی آسان بات تھی؟ جیسے سفر کرتے کرتے گلستاں کی حد ختم ہو اور تپتے صحرا کا سفر' دکھ' تنہائی اور ہمسفر کی عدم دستیابی کا احساس کے ساتھ دس سال کا طویل عرصہ اس نے بتایا۔ رستے میں کتنی کٹھنائیاں تھیں۔ کیسی کیسی مشکلیں تھیں!

دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی رافعہ! پیدا ہوئی تو ماں باپ نے بہت خوشی منائی تھی۔ ماں کو اپنا دکھ سکھ بانٹنے کو سہیلی مل گئی تھی۔ اس نے بیٹی کو بے حد چاؤ سے پالا۔ بہت لاڈ اٹھائے۔ سولہ سال تو جیسے پھولوں کے بستر پر گزرے تھے۔ کسی دکھ پریشانی سے واسطہ

پڑا۔ کوئی فکر کبھی چھو کر نہ گزری۔ باپ اور بھائی بھی دیوانے تھے۔ آگے پیچھے پھرا کرتے دکھ سے پہلی پہلی آشنائی باپ سے جدائی کی صورت ہوئی۔ سولہ برس کی تھی جب باپ ایک ٹریفک حادثے میں اپنے خاندان کو چھوڑ کر چل دیا۔ بھائی دونوں بڑے تھے اور تب تک اس قابل تو ہو چکے تھے کہ ماں اور اکلوتی بہن کے سر کا سائبان بن سکیں۔ دونوں نے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارے اور کسی نہ کسی کنارے سے لگ ہی گئے۔ نوکریاں بھی کیں اور پڑھائی بھی کرتے رہے۔ اسے بھی بھائیوں کی دیکھا دیکھی نوکری کا شوق چرایا تھا۔ اس نے بھی انٹر پاس کر کے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی اور اپنا تھوڑا بہت خرچہ خود ہی اٹھانے لگی۔

ماں نے جلد ہی دونوں بھائیوں کے سر پر سہرا سجا دیا اور گھر میں بہوئیں لے آئی۔ گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک ایک کمرہ دونوں بھائیوں نے لے لیا' تیسرے کمرے میں یہ ماں بیٹی بسیرا کرنے لگے اور پھر اس کی عمر کا مشکل دور شروع ہوا۔ اسے بیاہنے کے منصوبے بننے لگے۔ ماں' بیٹوں اور بہوؤں سے سر جوڑ کر باتیں کرنے لگی۔ گھر میں رشتے کرانے والیوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اور ان کے توسط سے لوگوں کا آنا جانا رہنے لگا۔

وہ بیس برس کی تھی! گھر میں جوان بھائیوں کو نئی دلہنوں کے چونچلے اٹھاتے' ان کے آگے پیچھے رومانی گانوں کی دھنوں پر سیٹیاں بجاتے' پھرتے دیکھا تھا۔ ایک تصوراتی' حسین نوجوان کو خوابوں میں اپنے آگے پیچھے پھرتا دیکھنے لگی' جب بھی تنخواہ ملتی' بازار جا کر اپنے جہیز کے لئے کوئی چیز لا کر رکھ لیتی۔ رفتہ رفتہ اس کے کمرے میں ڈبہ بند چیزوں کا ڈھیر لگنے لگا۔ ٹی وی' سلائی مشین' برتن' اٹیچی کیس' واشنگ مشین .... وہ کیا کچھ نہ خریدتی گئی۔ یہاں تک کہ عمر نے بیس کے ہندسے سے چھلانگ ماری اور سیدھی پچیس پر جا گری۔ درمیانی عرصہ تو رشتوں کے ہجوم' اصرار و انکار اور جہیز کی تیاری میں یوں گم رہا تھا کہ اسے ان چند سالوں کے آنے اور چلے جانے کی خبر تک نہ ہوئی۔

پچیس برس کی ہوئی اور ایک دن اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ماں داغ مفارقت دے گئی تب جیسے وہ ہڑبڑا کر کسی خواب سے جاگی تھی!

یہ کیا ہوا؟ وہ کہاں کھڑی تھی؟ اسے کہاں جانا تھا؟ اس کے ساتھ کون کون تھا؟ وہ گھبرا گھبرا کر آس پاس دیکھنے لگی۔

تب اس نے جانا کہ وہ اکیلی تھی! اس کے آس پاس جو تھے وہ اس سے دامن چھڑانے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔ وہ گھر جس کا تا حال کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ جیسے کسی اجنبی رستے پر کھڑی تھی اور دن ڈھل رہا تھا!

دونوں بھائیوں کے دو دو بچے ہو چکے تھے۔ انہیں ایک کمرہ چھوٹا پڑتا تھا۔ بھابیوں کو اچانک ہی اس کے بدن میں اُگے ہوئے کانٹے چبھنے لگے تھے۔ انہیں اس کمرے کی اشد ضرورت تھی۔ جس کمرے میں رافعہ کا سامان اور رافعہ کا پلنگ پڑا تھا۔ انہیں رافعہ کی معمولی شکل و صورت سے چڑ ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے اسے اچھا رشتہ نہ ملتا تھا۔ رافعہ کی کم پڑھائی پر وہ ناک بھوں چڑھا کر باتیں بناتی تھیں۔ کوئی گن تو ایسا ہوتا جس کی بناء پر لڑکے والے ہاں کہہ کر جاتے! پھر آنے والوں کے چائے پانی کا خرچ...... بھلا اس قدر مہنگائی کے زمانے میں ہر دوسرے روز کیک بسکٹ منگوا کر چٹورے اور ندیدے لوگوں کا پیٹ بھرنا کوئی آسان بات تھی؟ وہ بھی ایسے لوگوں کو جو جاتے جاتے 'نہ' کہنا نہ بھولتے تھے۔

لڑکی کا رنگ کم ہے۔

لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔

لڑکی کے بال لمبے نہیں ہیں۔

لڑکی کی تعلیم کم ہے۔

اس نے خود تقریباً ہر طرح کا اعتراض سنا۔ اس طرح کہ وہ وجود سے عدم بننے لگی۔ اس کی شخصیت دھوپ میں پڑی برف کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ وہ اندر سے چھوٹی اور اوپر سے بڑی ہونے لگی۔ چھبیس، ستائیس، اٹھائیس...... ہر سال اپنی سالگرہ پر بے حد خوفزدہ ہو جایا کرتی۔ ''یا اللہ! اگلی سالگرہ سے پہلے یا ڈولی بھیج دینا یا ڈولا!''

وہ رات کو رو رو کر دعا کرتی۔ بھابیوں کے تیور خطرناک سے خطرناک تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ انہیں ایک مستقل خطرہ نظر آنے لگی تھی۔ ان کی گفتگو برچھیوں کی صورت اختیار کرنے لگی تھی جب ایک دن قسمت کا قفل کسی اسم اعظم کی برکت سے کھلا۔

پانچ عورتیں اسے دیکھنے کے لئے آئی تھیں! سب کی سب ایسی حسین و جمیل کہ بندہ لیموں کاٹنے لگے تو انگلیاں کٹ جائیں! اس کی بھابیاں چونکہ کچھ کاٹ نہ رہی تھیں سو

انگلیاں دانتوں سے ہی کاٹنے لگیں۔

''انہوں نے کہاں اسے پسند کرنا ہے؟''

''ارے...... چاند کی طرح چمک رہی ہیں پانچوں...... رافعہ تو چاند کا داغ بھی نہیں۔''

''کلائیاں سونے کی چوڑیوں سے بھری پڑی ہیں...... گلے میں چار چار سونے کی زنجیریں ہیں۔ خاندانی رئیس معلوم ہوتے ہیں۔''

دونوں بھابیاں ہر مرتبہ آ کر اسے ایک نئی بات کہتیں۔ وہ چھوٹے سے کچن میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چائے اور دیگر لوازمات بھی اس نے بھابیوں کے ہاتھ ہی اندر بھیج دیئے تھے۔ بھلا اپنا مذاق بنوانے سے کیا حاصل تھا؟ بھابیوں سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اس نے مہمانوں کے سامنے جانے کا ارادہ ہی منسوخ کر دیا تھا۔

لیکن پھر آنے والیوں نے بصد اصرار سے بلوایا۔ وہ گئی تو سب نے بے حد تپاک سے مصافحہ و معانقہ اور جاتے جاتے دوبارہ آنے کی نوید سنا گئیں۔ رافعہ کو تب بھی یقین تھا کہ وہ پانچوں پھر کبھی ان کے گھر کے آس پاس بھی نظر نہ آئیں گی۔ بھلا انہیں اپنے سب سے چھوٹے دیور سے کس جنم کا بدلہ لینا تھا جو وہ رافعہ کو اس کے لئے پسند کرتیں! وہ تو ان کے درمیان بیٹھی نظر کا ٹیکہ ہی معلوم ہوتی!

تب اچانک ہی سب گھر والوں کو حیرت نے پتھر کا کر دیا۔ ان پانچ عورتوں میں سے دو عورتیں پھر آئی تھیں اور اب باقاعدہ طور پر رافعہ کا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے دیور عمران کے لئے اسے پسند کر چکی تھیں۔

بڑی بھابی جب رافعہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے کمرے میں آئیں تو اتنا بڑا بوجھ ہلکا ہو جانے کا احساس ان کے انداز میں کہیں نہیں تھا۔ وہ اڑی اڑی رنگت اور پھیکی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے مبارک باد دے کر ان عورتوں کے پاس لے گئیں۔ وہ دونوں لڑکے کی بڑی بھاوجیں تھیں۔

''میرا نام قدسیہ ہے...... ''ایک مسکرائی تھی'' میں تمہاری سب سے بڑی بھابی ہوں۔''

''میں یاسمین ہوں۔'' دوسری بھی خندہ پیشانی سے بولی ''میں دوسرے نمبر کی بھابی ہوں......''

''یہ کل چھ بھائی اور تین بہنیں ہیں'' قدسیہ بھابی اسے تفصیل بتانے لگیں

"ہمارا خاندان ماشاء اللہ بہت بڑا ہے۔ سب بھائی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ جتنا بڑا خاندان ہے' اتنا ہی بڑا گھر بھی ہے۔ دراصل ہماری ساس چاہتی ہیں کہ ان کی زندگی میں بٹوارہ نہ ہو۔ وہ خود تو بیمار ہیں' بچاری بستر سے لگ چکی ہیں...... ان کا اٹھنا' بیٹھنا' کھانا' پینا' ٹوائلٹ' سب بستر پر ہی ہوتا ہے...... کبھی ایک بہو کی ڈیوٹی لگتی ہے' کبھی دوسری کی...... پانچوں بہوئیں مل کر ان کی خدمت کر رہی ہیں...... چھٹی بہو کو بھی یہ سب کرنا ہوگا......" وہ دبے دبے انداز میں بولیں۔

"دراصل عمران کا اپنی امی سے بہت پیار ہے......" اب یاسمین نے بولنے کی ذمہ داری سنبھالی' "وہ کہتا ہے' ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جو اس کی ماں کا خیال رکھے۔ دن رات اس کی خدمت کرے' دعائیں لے' اسے لڑکی کی شکل صورت' خاندان' جہیز وغیرہ سے دلچسپی نہیں۔ ماشاء اللہ گھر میں کسی شے کی کمی نہیں۔ روپیہ پیسہ اللہ نے بہت دیا ہے۔ لڑکے سبھی قابل اور نیک ہیں۔ اپنا بزنس ہے...... سب پیار محبت سے' اتفاق سے' مل جل کر رہتے ہیں۔ ہاں' البتہ آنے والی کو اپنی ساس کی خدمت کرنا ہوگی۔"

یاسمین نے رافعہ کا جھکا ہوا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں......" رافعہ کی بھابی جلدی سے بولی تھیں' "بہوؤں کا فرض ہے ساس سسر کی خدمت کرنا۔ اللہ بخشے جب تک ہماری ساس زندہ رہیں' ہم نے جی جان سے ان کی خدمت کی' کوئی کمی نہ کی...... جھولیاں بھر بھر ان کی دعائیں لیں...... رافعہ تو خود گواہ ہے اس بات کی!" رافعہ سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا نہ گیا۔

"پھر ہم...... یہ رشتہ پکا سمجھیں؟" قدسیہ بھابی بولیں۔

"ضرور بہن...... بہت بہت مبارک ہو......" رافعہ کی بھابی اُٹھ کر سب کا منہ میٹھا کرانے لگیں رافعہ شرما کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کا دل خوشی کے مارے گیس کے غبارے کی طرح اوپر ہی اوپر جاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ انگ انگ سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ ایک معمولی شکل وصورت اور معمولی گھرانے کی لڑکی کے لئے ایسا رشتہ نعمت غیر مترقبہ سے کسی طور پر کم نہ تھا۔ لڑکے کی بھابھیاں نئے ماڈل کی لشکارے مارتی گاڑی میں بیٹھ کر آتی تھیں رافعہ خود کو اسی گاڑی میں چاند نگر کی سیر کرتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

"لڑکے کی ماں کی خدمت کروانی ہے اس سے......" اس کے کانوں میں چھوٹی بھابھی کا سلگتا جملہ پڑا تھا' "تبھی لئے جا رہے ہیں بنا شکل وصورت دیکھے...... ہنہہ بھلا ملازماؤں کی شکلوں پر بھی کوئی غور کرتا ہے!"

رافعہ نے سنا اور ان سنی کر دی۔ وہ بہت خوش تھی۔ یہاں بھی تو وہ بھائی اور بھابیوں کی خدمت ہی کر رہی تھی۔ اس پر سو سو باتیں بھی سنتی تھی' پھر ایک ساس کی خدمت کر کے اپنے شوہر کو خوش کرنا کون سا مشکل کام تھا؟

❁ .... ❁ .... ❁

رات بھیگ اور بیتی تو ہنستی مسکراتی' سیج پر تنہا ہی اٹھکیلیاں کرتی رافعہ کا ماتھا ٹھنکا۔ کسی کی آمد کا کچھ سراغ نہ تھا! پانچ بھابیاں اور تین نندیں بھی کچھ ہی دیر اس کے پاس بیٹھی تھیں پھر کسی کو اپنے بچے یاد آ گئے تھے تو کسی کو اپنا شوہر۔ وہ سب کی سب جمائیاں لیتی ہوئی چلی گئی تھیں۔ یوں بھی لمبے چوڑے خاندان کی یہ آخری شادی تھی۔ سبھی ان جھمیلوں سے اکتا چکے تھے اب شادی بیاہ کے قصیے نمٹانا بھی ایک دردسری کی مانند تھا۔ عورتیں تو بہت جلد ان چکروں سے اوب جایا کرتی ہیں۔ انہیں اپنی شادی ہو جانے کے بعد دوسری شادیاں کچھ زیادہ نہیں بھاتیں نرا آرام کا نقصان! بے سکونی۔

رافعہ لڑیوں سے گلاب اور گلابوں سے پتیاں توڑتی رہی۔ بکھیرتی رہی۔ حتیٰ کہ گھڑی نے دو بجا دیئے اسے نیند ستانے لگی۔ دولہا میاں پر غصہ آنے لگا۔ پہلی پہلی رات ہی بے نیازی کا یہ عالم تھا' آئندہ زندگی میں کیا امید کی جا سکتی تھی؟

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور رافعہ نے سنہری شیروانی کی جھلک دیکھی۔ وہ جلدی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ہتھیلیاں بھیگنے لگی تھیں۔

"السلام علیکم......" آنے والا اس کے قریب بیٹھ گیا۔

آواز میں تھکن اور پریشانی تھی۔ رافعہ نے جھینپے جھینپے سے انداز میں جواب دیا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ حسیات چوکس تھیں۔ جسم غیر محسوس طور پر اکڑا ہوا تھا۔ وہ دولہا کی جانب سے کسی شوخ سی جسارت کی ذہنی طور پر پیش بندی کر رہی تھی۔

"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے......" دولہا کے اگلے جملے نے اس کے تنے ہوئے

اعصاب پر بہت مہارت سے سفر کیا تھا اور ٹھیک اس کے دماغ پر جا کر لگا۔

اس کے اعصاب کا تناؤ یکا یک رخصت ہوا وہ پوری آنکھیں کھول کر اپنے شوہر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ رافعہ کے دل کو یک گونہ تسلی ہوئی۔ خوشی ایک بار پھر اس کے وجود میں رقص کناں ہوئی۔ اس کا جی چاہا' مارے خوشی کے خود ہی اس سے لپٹ جائے۔ لیکن اگلے ہی پل اس کی خوشی میں واضح کمی ہوئی۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔

''میں اب تک امی کے پاس ہی تھا۔'' وہ کہہ رہا تھا'' یہاں سب لوگ اس قدر خودغرض ہیں کہ چیخ اٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے' موقع ایسا ہے کہ سبھی تھک چکے ہیں' لیکن ایسی بھی کیا تھکن جو اس قدر بے حسی طاری کر دے کہ ایک بیمار' لاچار شخص سے دو بول محبت کے نہ بولے جائیں۔''

رافعہ کے رومانی جذبات آبی بخارات کی مانند اڑنے لگے۔ اس شخص کے انداز میں ایسی ہی تپش تھی۔ ''امی اپنے کمرے میں بالکل اکیلی ہیں۔'' وہ بولا'' سب بھابیاں اپنے اپنے کمروں میں جا چکی ہیں اور تو اور میری بہنیں تک اپنی ماں کی خاطر اپنی نیند کی قربانی دینے پر تیار نہیں ہیں۔ گھر میں سبھی سو چکے ہیں۔ تم کہو کیا اس صورت حال میں میں اپنی سہاگ رات منا سکتا ہوں؟ جبکہ دوسرے کمرے میں میری ماں تنہا پڑی اپنی بیماری سے نبرد آزما ہو؟''

رافعہ کے دل کو یکا یک مایوسی اور شکستگی کے دبیز بادلوں نے گھیر لیا۔ خوشی اور شوخی بجھ کر رہ گئیں۔ اسے اپنی زندگی کی سب سے خوبصورت رات کے زیاں کا احساس ستانے لگا۔ اس کا دولہا بالکل بھی اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ اس نے رافعہ کے چہرے کو غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کا ہار سنگھار بے کار گیا۔ سب تیاری کرکری ہو گئی۔ سب جذبے بالکل ماند پڑ گئے۔ گویا دولہے میاں نے لالٹین کی لو بالکل مدھم کر دی تھی۔

''ہم اتنے خودغرض نہیں ہو سکتے!'' یکا یک اس نے سر اٹھا کر رافعہ کو دیکھا'' ہم دوسروں کی طرح بے حس نہیں ہیں۔ پیار محبت کی باتوں کے لئے عمر پڑی ہے رافعہ...... آؤ' آج کی رات ہم دونوں مل کر امی کی خدمت کریں اور ان کی دعائیں لیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی!'' وہ بہت ہمت کر کے بولی تھی۔

''آؤ میرے ساتھ!'' وہ کھڑا ہو گیا۔

رافعہ بھی اس کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جنت جیسے کمرے کو چھوڑ کر کہیں جانے کو بالکل من نہ کرتا تھا۔ ابھی تو اس نے اپنی رونمائی کا کوئی تحفہ تک وصول نہ کیا تھا۔ ابھی تو چاہت کے اظہار کا پہلا پہلا لین دین بھی نہ ہوا تھا۔ ابھی تو...... اس کی زخمی سوچیں سسکتی رہیں اور وہ اپنے میاں کے پیچھے چلتی رہی۔

چند قدموں کے فاصلے پر ہی اس کی ساس کا کمرہ واقع تھا۔ گویا اس بات کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا کہ رافعہ ان کے نزدیک تر رہے۔

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو بستر پر پڑا نحیف و نزار وجود کھانسنے لگا۔

''آؤ رافعہ۔ امی سے ملو۔'' عمران ماں کے قریب بیٹھ گیا۔

رافعہ نے ساس کو بہت ادب سے جھک کر سلام کیا۔

''جیتی رہو...... جیتی رہو......'' انہوں نے کھانسی کے درمیانی وقفوں میں کہا تھا۔ ''بیٹھو...... یہاں میرے پاس بیٹھو''

رافعہ اپنا بھاری بھرکم لباس سمیٹتی ان کے قریب بیٹھ گئی۔

''ہاں ٹھیک ہے!'' انہوں نے اکھڑتی سانسوں میں بھی اس کا بغور جائزہ لیا۔ ''ایسی ہی لڑکیاں اچھی' خدمت گزار ہوتی ہیں...... میں نے بہت غلطی کی...... خوبصورت سے خوبصورت بہوئیں ڈھونڈتی رہی...... وہ سب کی سب شو پیس ہیں...... باربی گڑیائیں ہیں...... ان سے تو بس ان کے شوہر ہی کھیل سکتے ہیں' بہل سکتے ہیں......''

رافعہ کا سر جھک گیا۔ ساس نے رونمائی میں کم نمائی کا طعنہ دیا تھا وہ بھی نئے دولہا کے سامنے۔ اسے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ ہتک کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''بہت اچھی ہو تم!'' پھر وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ ''مجھے پسند آئیں عمران بہت خوش رہے گا۔ یاد رکھنا...... یہ ایک ماں کے دل سے نکلی ہوئی دعا ہے۔''

رافعہ کا ٹوٹا ہوا دل پھر سے سنبھلا۔ ہونٹ مسکرائے۔ وہ پلکیں جھپکنے لگی۔

ساس نے اپنی انگلی سے زمرد کی انگوٹھی اتار کر اسے پہنا دی۔

''یہ لو اپنا تحفہ...... عمر بھر سنبھال کر رکھنا اسے...... قدسیہ کی بہت نظر ہے اس پر...... کئی بار مانگ چکی ہے مگر میں نے نہیں دی...... کیوں دوں اسے؟ کیا خدمت کی ہے اس نے

میری؟ بیٹیاں تو فطری طور پر ہی پیاری ہوتی ہیں لیکن بہو تب جی پر چڑھتی ہے جب جی جان سے خدمت کرے...... میری پانچ بہوئیں آئیں...... سب کی سب نکمی ' ہڈ حرام...... اب چھٹی تم ہو...... دیکھتے ہیں' تم کیسی نکلتی ہو......"

وہ مسلسل بولنے کی عادی تھیں۔ وہ سب کچھ جوان کے دل میں آتا تھا۔ ان کے دل اور زبان کے درمیان غالباً سوچ کا کوئی مقام نہ تھا۔ پھر انہوں نے خاموش بیٹھے ہوئے عمران کو دیکھا "میرے بیٹے!" وہ اسے چکار کر بولیں "کیوں بیٹھے ہو؟ جا کر سو جاؤ...... میں اب ٹھیک ہوں!" رافعہ کے تھکے تھکے جذبات پھر سے چونکے۔ رہائی کا پروانہ ہاتھ آنے لگا تھا۔ اب شاید چند رنگین لمحات کی اجازت ملنے لگی تھی۔

"نہیں امی!" عمران بولا "آپ سو جائیں پھر ہی میں جاؤں گا!"

"میں کہاں سوؤں گی اب...... میری نیند اڑ گئی ہے......" وہ بولیں' "اب تو بقیہ رات آنکھوں میں ہی کٹے گی۔ سانس بار بار اکھڑتا ہے......"

"پھر ہم بھی یہیں بیٹھے ہیں۔" عمران بولا۔

رافعہ کا سر جھکنے لگا۔ اسے زیورات کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ گردن درد کرنے لگی۔

"تم تو صبح کے اٹھے ہو...... دن بھر کی بھاگ دوڑ۔ تھوڑا آرام کر لو...... ہم ساس بہو تو خوب باتیں کریں گے...... تم جا کر نیند لے لو!"

"چھن" سے رافعہ کے جذبوں کے بلوریں جام لڑھکے اور ٹوٹ گئے۔ نیند بھک سے اڑ گئی۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس قدر حسین' رومانی رات اور بیمار' نیم پاگل ساس سے گفتگو میں گزر جائے! ہائے! جذبوں کی ایسی بے قدری اور کہیں نہ ہوئی ہو گی۔

اس کا دل دہائیاں دینے لگا۔ خاموشی سسکنے لگی۔ کہیں وہ ماں کی بات مان ہی نہ لے۔ کہیں وہ اسے وہاں چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ اس کی وہاں موجودگی سے تو پھر بھی دل کو کچھ ڈھارس تھی۔

"رافعہ!" عمران بولا "تم لباس تبدیل کر آؤ۔ ان کپڑوں میں تو تھک جاؤ گی۔ پھر تم یہاں امی کے پاس سو جاؤ۔ میں اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا!"

ہائے! وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ دشمن جاں اسے کس اطمینان سے وہ رنگ روپ

بگاڑ دینے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس نے تو ٹھیک سے اسے دیکھا تک نہ تھا...... اس کی تعریف میں ایک لفظ تک نہ بولا تھا۔ وہ روپ جو کوئی لڑکی پہلی اور آخری مرتبہ اپناتی ہے' اس روپ کو مٹاتی رافعہ کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

لباس تبدیل کر کے' زیورات سے بری ہو کر' چہرہ دھو کر واپس ساس کے کمرے میں چلی آئی۔ عمران اب کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"امی کا خیال رکھنا!" وہ اسے تاکید کر کے چلتا بنا۔

رافعہ ست روی سے اسی کرسی پر جا بیٹھی تھی! وہ بے حد پژمردگی محسوس کر رہی تھی۔ ایسا تو اس نے اپنی تیس سالہ زندگی میں کبھی نہ سنا تھا کہ کسی آدمی نے اپنی سہاگ رات یوں اپنی بیمار بڈھی ٹھنڈی ماں کے سر پر سے وار کر پھینک دی ہو۔ یوں تو روز صبح ہوتی ہے روز رات آتی ہے لیکن ہر شے کی ایک الگ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ اس قیمت کو محسوس کرنا چاہئے۔ اس شے کے انمول ہونے کا لحاظ ہونا چاہئے ورنہ تو زندگی میں کسی بات کی کچھ اہمیت ہی نہ ہو۔ وہ دلہن بنی' کیا کیا ارمان ہوتے ہیں دلہن بنتی لڑکی کے دل میں' وہ سیج پر بیٹھی' کیسے انمول خزانے جیسے جذبوں کو محسوس کیا اس نے...... لیکن ظالم ماں اور نادان بیٹے نے ہر' ہر جذبے کو پامال کر ڈالا۔ سبھی ارمان خاکستر کر دیئے۔

"اداس ہو؟" فیروزہ بیگم کی سرگوشی نما آواز نے اسے چونکا دیا۔

"جج...... جی......" وہ کرسی پر سے گرتے گرتے بچی پھر سنبھل کر بیٹھ گئی'

"نن...... نہیں تو امی جان...... بھلا میں کیوں اداس ہونے لگی؟"

وہ مسکرائیں۔ جیسے انہوں نے بلی کے بچے کو اچھلتی گیند سے ڈرتے دیکھا ہو۔ ان کی نظروں سے اس کی بے عقلی کے لئے ایسا ہی معصومانہ تمسخر تھا

"آج تمہاری شادی کی پہلی رات ہے...... اور تم یہاں مجھ بڈھی کی تیمارداری کو بیٹھی ہو...... تمہیں یوں لگتا ہو گا جیسے تم پر ظلم کی انتہا ہو گئی ہے۔ ہے نا؟"

رافعہ ان سے خوف زدہ ہو گئی۔ وہ تو بہت ہوشیار خاتون تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بیماری کا ناٹک رچائے لیٹی ہوں۔ اس وقت وہ بالکل بیمار نہ لگتی تھیں۔

"نہیں امی جی!" وہ نگاہیں جھکا کر' تھوک نگل کر بولی "ایسی تو کچھ بات نہیں۔

راتیں تو آتی جاتی رہیں گی۔ ساری عمر پڑی ہے...... ایک بیمار ماں کی خدمت سے زیادہ قیمتی تو کچھ نہیں......"

وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرائیں۔

"ہاں...... "وہ بولیں، "...ٹھیک کہا تم نے...... اگرچہ جو کچھ زبان سے کہا، دل نے اس کی تائید نہ کی، پھر بھی زبان نے جو کہا، سچ کہا...... جانتی ہو رافعہ! زندگی کی اصل حقیقت کہاں واضح ہوتی ہے؟"

رافعہ نے کچھ نہ کہا۔ بس خاموشی سے انہیں دیکھا۔

رافعہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے کب سوچا تھا کہ ایسی مقدر والی رات میں وہ ایسی دلخراش باتیں سنے گی۔ بیماری کے قصے۔ موت کی باتیں۔

اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

"تمام عمر کا خلاصہ...... ان آخری سانسوں میں سمٹ آتا ہے...... یہ سانسیں جو کبھی جمتی ہیں، کبھی اکھڑتی ہیں، کبھی رکتی ہیں، کبھی چلنے لگتی ہیں...... ہر ہر سانس کی الوداعگی جی کو عجب دھڑکا بخشتی ہے...... نجانے اگلی سانس نے آنا ہے یا پھر یہ جاتی ہوئی سانس ہی آخری ہے! لیکن تم کہاں سمجھو گی؟ ابھی تو تمہاری سانسوں میں تازگی ہے، مضبوطی ہے، یقین ہے، پیار ہے، خوشبو ہے...... تم کہاں سمجھو گی...... اخیر عمر کی مبہم اشاروں والی سانسیں کیسی ہوتی ہیں...... کیا کہتی ہیں......"

رافعہ کو نیند آنے لگی تھی۔ اسے ان کی غیر دلچسپ اور روکھی باتیں بالکل بے مقصد اور فضول لگ رہی تھیں۔

"بائیس برس کی تھی میں...... جب دلہن بنی!" فیروزہ بیگم کی زرد آنکھیں یکایک کسی پرانی مگر قیمتی سوچ کے اثر سے چمکیں۔ "بڑے رئیس لوگ تھے ہم بہت خرچا کیا تھا میرے باپ نے...... اس زمانے میں میرا شادی کا جوڑا پچاس ہزار میں تیار ہوا تھا۔ لوگوں نے انگلیاں چبا ڈالی تھیں اپنی...... ہاہ!" رافعہ کی نیند ذرا پیچھے ہٹی۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر ان کا چہرہ دیکھا۔ زرد رو، جھریوں سے بھرا چہرہ اور پچاس ہزار کے عروسی جوڑے کا خیال! آج بھی اس خیال نے اس بیمار چہرے کو قدرے رونق دے دی تھی۔ وہ کسی سوچ میں گم مسکرا رہی تھیں۔

"بہت حسین لگی تھی میں وہ لباس پہن کر! خان صاحب تو مانو دیوانے ہو گئے تھے مجھے دیکھ کر......" رافعہ کی نیند بالکل غائب ہو گئی۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ منحنی، لاغر وجود اور بے بہا حسن کا دعویٰ!

"تم سمجھتی ہو، میں جھوٹ بول رہی ہوں......" وہ اچانک بولیں۔

"ن...... نہیں امی جی......" وہ بے تحاشا گھبرا گئی۔

فیروزہ بیگم یک لخت ہی بہت آزردہ ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

"آہ!" ان کے لبوں سے کراہ نکلی۔ "کسی شئے کی کچھ حقیقت نہیں رافعہ...... سب سراب ہے، سب دھوکہ ہے، سب آنکھوں پر پڑا ہے...... وہ بیش قیمت جوڑا میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا...... وہ بھاری زیورات اس وقت مجھے زندگی سے پیارے تھے...... آج میرے لئے مٹی برابر ہیں...... اس حسین رات کا کوئی رنگین لمحہ مجھے یاد نہیں...... مجھے تو بس وہ لمحے یاد ہیں...... جو آنے والے ہیں بس...... پہنچنے والے ہیں۔

ان کی آنکھیں کسی خوف کے احساس سے پھیل گئیں اور کھانسی کا بے تحاشا دورہ پڑا۔ رافعہ جلدی سے اٹھ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔ ان کی کمر سہلانے لگی۔ پھر کھانسی کی شدت کم ہونے پر اس نے انہیں پانی پلایا۔

"اچھی لڑکی ہو تم!" وہ بمشکل بولیں اور ہانپنے لگیں۔ "میری خدمت کر کے دعائیں لو میری......"

"خدمت!" رافعہ کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

نجانے اب کب تک اس آدھی پاگل خاتون کی خدمت کرنا تھی۔ شادی سے قبل اس نے کئی مرتبہ یہ طعنہ سنا تھا کہ لڑکے والوں نے اسے ایک بیمار عورت کی مستقل خدمت کے لئے چنا ہے لیکن اس نے کبھی اس بات کو چنداں اہمیت نہ دی تھی۔ اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے شاید اندھی کھائی میں چھلانگ لگا دی ہے۔ اب باہر نکلنا قسمت پر منحصر تھا۔

"میرے چھ بیٹے ہوئے اور تین بیٹیاں۔ اللہ نے اولاد کی نعمت سے خوب خوب نوازا...... لوگ مجھ پر رشک کرتے تھے......" وہ پھر بولنے لگی تھیں۔ "کیا نہیں تھا میرے پاس؟ حسن، بھرپور جوانی، چاہنے والا شوہر، دولت، اولاد...... ہر نعمت کی فراوانی تھی۔ آہ! رافعہ! کوئی مجھ سے کہے کہ وہ سب چیزیں لوٹا دو اور ان چیزوں سے خالی زندگی لے لو...... تو میں فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ نہ لگاؤں۔ میں مزدور کی بیوی بن جاؤں...... لیکن بچپن، جوانی، پھر

سے لے لوں۔ عمر دوبارہ گزاروں...... جیسے عمر گزارنے کا حق ہوتا ہے...... میں نے تو اتنی لمبی عمر میں ناز نخرے اور غرور کے سوا کچھ جانا ہی نہیں۔ بڑا ٹھسکہ تھا میرا...... بہت دبدبہ تھا۔ نوکر چاکر' رشتہ دار سبھی نظر جھکا کر بات کرتے تھے مجھ سے......" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیں۔ جیسے اندر ہی اندر رو دی ہوں۔

رافعہ کی خاموش مگر تاسف سے بھری نظروں نے اب کی بار نہایت تفصیل سے ان کا جائزہ لیا کمزور' لاغر وجود' استخوانی ہاتھ' جھریوں دار پیلا چہرہ اور مردہ آنکھیں......

"دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو......" وہ اسے اپنا جائزہ لیتا دیکھ کر دکھ اور حسرت سے بولیں۔ رافعہ نے جھٹ نگاہیں جھکا لیں جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

"تم سوچتی ہو گی رافعہ...... اس بڑھیا نے تمہاری زندگی سے بہت قیمتی شئے چھین لی ہے...... ہے نا؟"

رافعہ اب کی بار خاموش رہی۔ انہیں انہماک توجہ سے سوچ پڑھ لینے کا ڈھنگ قدرت نے عطا کر دیا تھا۔ لیکن اب یہ فن شاید ان کے کسی کام کا بھی نہ تھا۔

"کچھ وقت گزر گیا تو تمہیں یہ بات یاد بھی نہ ہو گی۔" وہ بولیں' اور یاد بھی رہ گئی تو تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو گی...... تم اپنے شوہر کے ہمراہ لاتعداد خوبصورت راتیں بتا چکی ہو گی۔ سینکڑوں باتیں کر چکی ہو گی...... ہو سکتا ہے کبھی تم دونوں یہ بات یاد کر کے خوب ہنسو...... ہے نا؟"

"جی!" وہ آہستہ سے بولی۔

"لیکن...... میری باتیں کبھی اپنے پلو سے جدا مت کرنا...... رافعہ! زندگی کی ابھی ابتداء کی ہے تم نے...... اور انتہا تمہیں دکھا دی گئی ہے...... یہ ایسا ہی ہے جیسے امتحانی پرچہ ملنے سے پہلے ہی اس کے سب سوالوں کا پتہ چل جائے...... ہاں! جواب تو تم نے ہی لکھنے ہیں لیکن سوالوں کا پتہ چل جانا کیا کچھ معمولی بات ہے؟ کاش!"

"کاش میری سہاگ رات بھی ایسی ہی گزری ہوتی...... تب شاید میرا دل بھی جینے میں سر پٹک کر روتا۔ لیکن امتحانی پرچہ تو دیکھ لیتی میں...... دل کا کیا ہے...... یہ بدتمیز' خودسر ضدی' بچہ ایک کھلونا مل جائے تو دوسرے کھلونا کے لئے رونے لگتا ہے...... ہے نا رافعہ؟"

"جی امی جان!" رافعہ بھی اسی دھند میں دیکھنے لگی جس دھند میں فیروزہ بیگم دیکھ

رہی تھیں۔ اسے ایک حسین' نیک' دولت مند' نوجوان کی ہمراہی ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر عطا ہوئی تھی اور وہ ایک رات کے زیاں کے افسوس تلے کراہ رہی تھی!

اسے پہلی بار فیروزہ بیگم کی گفتگو کے غیر معمولی پن کا اندازہ ہوا۔ اس کی نیند اب مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔ دماغ پوری طرح چوکس تھا۔ ایسی گفتگو وہ زندگی میں پہلی بار سن رہی تھی۔ وہ کمرہ' گلابوں کی مہک' سیج کی لڑیاں...... وہ سب کچھ بھول بھال کر موت کے آہنی ہاتھوں سے نبرد آزما اکھڑتی سانسوں کی کہانی سننے لگی تھی۔

"عمر ایسے گزری جیسے کوئی پرندوں سے بھرا ہوا پنجرہ کھول کر زور زور سے ہلائے اور پرندے ایک دوسرے سے الجھتے' گرتے پڑتے کھلے دروازے سے نکل نکل کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتے چلے جائیں...... ایسے ہی رافعہ...... بس ایسے ہی گزر گئے اس دھوکہ باز زندگی کے سبھی سال...... اب خالی پنجرہ منہ چڑا رہا ہے کہ ہے کچھ ڈالنے کو؟ شاید کچھ نہیں ہے...... کچھ بھی نہیں!"

وہ تھک کر گہرے گہرے سانس بھرنے لگیں۔

"بہت مان تھا مجھے...... بہت غرور تھا' چھ بیٹوں کی ماں تھی میں! چھ بیٹے...... مقدر سے ملتے ہیں۔ مقدر کی تو دھنی تھی نا! سوچتی تھی ایسی بہوئیں لاؤں گی کہ ایک زمانہ دیکھے گا...... لڑکیاں دیکھنے جایا کرتی تو ناک بھوں چڑھا کر لوٹتی...... کسی میں کوئی عیب ڈھونڈتی' کسی میں کچھ نقص جتاتی...... ہیروں جیسی لڑکیاں تلاش...... ایک سے بڑھ کر ایک...... بڑے بڑے اونچے خاندانوں کی لڑکیاں دیکھی ہیں نا تم نے پانچوں؟ ہے کوئی کمی کسی میں؟"

پھر وہ نیم دیوانگی سے ہنسیں۔ کچھ دیر ہنستی رہیں۔ رافعہ خوفزدہ سی ہو گئی۔

"کمی تو میرے مقدر میں ہوتی گئی...... ہر عروج کو زوال ہے نا...... بھول گئی تھی میں...... حسن گیا' جوانی گئی...... ایک ایک کر کے پرندے اڑتے گئے...... اور اب دیکھو مجھے! ان پانچ بہوؤں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جسے یہ بات یاد ہو کہ میں اسے کتنے چاؤ سے بیاہ کر لائی اور اپنا خونِ جگر جلا کر پالا ہوا بیٹا اسے دیا۔ سب میرے بیٹوں پر ایسا حق جتاتی ہیں جیسے انہیں بھی اپنے میکے سے لائی ہوں......"

رافعہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کے استخوانی ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے

خلوص کا اظہار کرنا چاہا تھا۔

"ہاں ہاں...... جانتی ہوں...... تم ایسی نہیں...... تم اچھی ہو...... عمران تمہیں میری خدمت کے لئے ہی لایا ہے۔ ورنہ اسے رشتوں کی کمی تھی؟ ایک سے ایک حسین' خاندانی کی مل رہی تھی اسے...... لیکن وہ بولا مجھے حور پری نہیں لانی۔ لڑکی ایسی ہو جو میری ماں کی [illegible] کرے [illegible] سے سنبھالے...... بہوئیں عیش کریں اور گھر کی اصل مالکن نوکروں کے رحم و [illegible] پر زندگی [illegible] آخر [illegible] سال گزارے...... کوئی انصاف ہے یہ؟ یہ گھر تو میرا ہی ہے نا؟ یہ میرے شوہر [illegible] میرے لئے بنوایا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر میری محبت اور میرے شوہر کی محنت کنداں ہے۔ لیکن ان پانچوں نے مجھے عضو معطل جان کر اسے چھوٹے سے کمرے میں لا پھینکا ہے...... جیسے باقی بنگلے پر تو میرا کچھ حق ہی نہیں حالانکہ یہ سب کچھ میرا ہی ہے۔ یہ گھر' گاڑیاں' بینک بیلنس...... بیٹے میرے ہیں تو سب میرا ہے؟ ہے نا رافعہ؟"

"جی امی جان...... سب آپ کا ہے!" وہ آہستگی سے بولی۔

"لیکن...... لیکن میں کیا کروں اس سارے کا؟" ان کی آواز رندھ گئی۔ "میں اب کیا کروں ان چیزوں کا؟" ساری عمر انہی چیزوں کی تمنا کی میں نے...... ساری عمر تمنا حاصل رہی مجھے لیکن اب...... اب کیا چاہوں رافعہ؟"

رافعہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ عورت کس قدر لاچار تھی۔ اتنے رشتے ناطوں کے باوجود کتنی اکیلی تھی۔

"بیٹے تو بیٹے...... بیٹیاں بھی لالچی ہیں...... سوچتی ہیں' ماں مرے تو حصے بخرے ہوں...... انہیں ان کا حصہ ملے...... زمین میں حصہ' زیور میں حصہ' گھر میں حصہ...... ماں کو اپنے حصے میں کوئی نہیں رکھتا کوئی نہیں رکھتا رافعہ......"

"ہم رکھیں گے امی...... میں اور عمران...... ہمیں کچھ نہیں چاہئے...... ہم آپ کو لے لیں گے......" وہ ان پر جھک گئی۔

"سچ!" وہ بے تحاشہ خوش ہوئیں "سچ کہہ رہی ہو...... خدا تمہیں خوش رکھے...... تم رکھو گی نا مجھے؟ میری خدمت کرو گی......"

"جی امی...... میں آپ کو اپنے ساتھ رکھوں گی...... آپ کی خدمت کروں گی......"

"خدا تمہیں خوش رکھے...... شاد آباد رکھے......" وہ مطمئن ہو گئیں۔

پھر جیسے جلے ہوئے پر پھایا رکھ دیا گیا۔ زخم مندمل ہونے لگا۔ درد کو قرار آنے لگا۔

فیروزہ بیگم باتیں کر کر کے تھک گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

رافعہ نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ اسے شدید تھکن کا احساس ہوا۔ اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گئی تھی۔

اچانک بپا ہونے والے غل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ اس کی نندیں اپنی ماں کو ہلا رہی تھیں۔

"امی جی...... امی جی...... اٹھیں...... آنکھیں کھولیں...... ہائے ماں! ہائے ہماری ماں......"

رافعہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے گھڑی کی سمت دیکھا جو صبح کے آٹھ بجا رہی تھی۔ اس کی نندیں مسلسل چیخ رہی تھیں۔ کمرہ لوگوں سے بھرنے لگا۔

فیروزہ بیگم اپنی عمر کی کتاب کا آخری صفحہ اسے سنا کر کتاب بند کر چکی تھیں۔ اس کی خدمت کی آس پر اسے آباد رہنے کی دعائیں دے کر وہ بنا کوئی خدمت لئے ہمیشہ کے لئے جا چکی تھیں۔ رافعہ نئی نویلی دلہن تھی۔ کسی نے اس کا خیال کر کے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی اسی سیج پر آ بیٹھی۔

کمرہ ویسے ہی مہک رہا تھا۔ گلاب اب تک تر و تازہ تھے۔ بستر بے شکن تھا۔ لیکن رافعہ! رافعہ وہ نہ رہی تھی۔

گھر میں پلاؤ زردے کی تیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ کمروں اور دالانوں میں دریاں بچھی تھیں۔ جن پر خواتین اور بچے آڑھے ترچھے بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ قرآن پاک کے سیپارے جز دانوں میں محفوظ اونچے طاقچوں میں رکھے ہوئے تھے۔ تسبیحوں اور دانوں کا ڈھیر جا بجا رکھا تھا۔ کسی کو اب مزید کچھ پڑھنے اور پڑھ کر مرحومہ کو ایصال ثواب کرنے میں دلچسپی نہ تھی۔ سبھی اکتا چکے تھے۔ سوئم کا کھانا کھا لینے کے بعد اب اونگھنے اور دوسرے دنیاوی مسائل پر گفتگو کر چکنے کے بعد رشتہ دار اور ہمسائیوں کو اپنا اپنا گھر یاد آیا تھا۔

گھر والے تھکن سے شل ہو چکے تھے۔ عمران کی بہنیں ایک کمرے میں بیٹھی مرحومہ ماں کے زیورات کے بٹوارے پر بحث میں مشغول تھیں۔ پانچوں بھابیاں اپنی ٹولی

الگ کیے بیٹھی تھیں اور نندوں کے خلاف بول کر اپنا اپنا دل صاف کر رہی تھیں۔

رافعہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھی اور گھر میں پھیلی مصروفیت کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پردے پر سے اپنی شادی کی رات کی فلم اب تک نہ اتری تھی۔ اس کا ذہن اب تک ان باتوں کی گردان کر رہا تھا۔ زندگی اپنی تمام تر سفاکی اور بھی بے رحم حقیقتوں کے ساتھ اس کے مقابل تھی۔

زندگی کی جو کتاب وہ شروع کرنے جا رہی تھی اس کا انجام اس نے پہلے ہی صفحے پر دیکھ لیا تھا۔

''سب کچھ میرا ہی ہے نا؟ یہ گھر' گاڑیاں' بینک بیلنس' بیٹے میرے ہیں تو سب میرا ہے!''

ایک کمزور اور بے بس لہجہ اس کے کانوں میں گونجتا۔

''ماں کو کوئی اپنے حصے میں نہیں رکھتا!''

''تم رکھو گی نا مجھے؟ میری خدمت کرو گی؟''

''تمہیں یہاں میری خدمت کے لئے تو لایا گیا ہے......''

رافعہ اپنے مہکتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔

ساری عمر ناز' فخر و بدبے اور ٹھیکے کے ساتھ بسر کر کے جانے والی کی اولاد اسی کے گھر میں بیٹھی بٹوارے پر بحث میں مصروف تھی۔

جانے والی سب کی خدمت اور تعاون سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

ہاں! مگر ایک تعاون اب بھی کیا جا سکتا تھا!

ایک خدمت ابھی باقی تھی!

رافعہ اس گھر میں اپنی آمد کا مقصد سمجھ گئی تھی۔

عمران کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا تو وہ قرآن پاک کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا اور وہ ہاتھ اٹھائے مرحومہ کی بخشش کے لئے دعا گو تھی۔

بس! یہی ایک خدمت باقی تھی!

یہ بلبلیں' یہ تتلیاں

خزاں کا موسم پھر لوٹ آیا تھا۔ ہر سال کی طرح! فضا میں وہی دکھ بھری' بھید بھری اداسی رچ گئی تھی۔ ہوا کے چلبلے' مدھر گیت ایک علیحدہ ہی لے میں ڈھل رہے تھے۔ کوئل کی کو کو دل کو اداس کرتی تھی۔ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا تھا۔ لیکن اسے اداسی کو مہمیز کرتی ان ہواؤں میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ بیتے ہوئے کل کی باتیں من آنگن میں گونجتی رہتیں۔ اس کا دھیان بٹا رہتا۔ محفل سجی رہتی تھی۔

زرد زرد خشک پتے اس کے قدموں تلے آ کر اپنی بے ثباتی پر کراہتے۔ وہ ان کی آواز کو بڑے غور سے سنا کرتا۔ کتنے پیغام پوشیدہ تھے ان مدہم مدہم سی سسکیوں میں کتنے موہوم اشارے تھے جنہیں سمجھنے کے لئے ایسی ہی تنہائی درکار تھی۔ وہ اس سنگی بنچ پر بیٹھ کر فنا اور بقا کے فلسفے کی گتھیاں سلجھایا کرتا۔ سود وزیاں کا حساب کتاب' جمع' تفریق' ضرب' کیا کھویا' کیا پایا'...... وہ اپنے دل میں جھانکتا اپنے ہاتھوں کی جھریوں کو بغور دیکھا کرتا۔ اپنی انگلیوں کے رعشے کا بڑھاؤ جانچنے کی کوشش کرتا۔ پھر اسے خزاں کی ہواؤں میں رچے ہوئے نوحے اپنی جانب متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ وہ ان پر سر دھننے لگتا۔ اپنا آپ بھولنے لگتا۔ سنگی بنچ کے بالکل ساتھ جامن کا پیڑ تھا۔ جامن کے اس پیڑ پر بہت سی اقسام کے پرندے بیک وقت جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی مختلف آوازیں' مختلف سازوں کی مانند مل کر ایک انوکھا گیت ترتیب دیتی تھیں جو اس کے کانوں کو بہت دلکش لگتا تھا۔ وہ ہوا کے نوحے اور ان نوحوں میں چھپا پیغام بھول جاتا۔ پرندوں کی آوازیں اسے اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھیں۔ وہ جامن تلے جمع پتھروں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے چڑیوں کا گیت سنتا رہتا۔ پتھروں کا ڈھیر وہاں کھیلتے ہوئے بچوں کی شرارت کا نتیجہ تھا۔ وہ جامنوں کے حصول کے لئے پتھر اچھالا کرتے تھے۔ یہ

لگا' جان پر الگ تکلیف جھیلو اور پھر بھی بیٹی!''

واجد خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بے حد تھک گیا تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ نے اس کے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اماں کی باتوں کی تائید یا تردید کی زحمت گوارا نہ کی۔

''پیسے کہاں سے لائے؟''

''ایک دوست سے ادھار لایا ہوں!'' اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

''بس ہو گئے خرچے شروع ...... بیٹیاں تو پیدا ہوئیں اور باپ کو کمانے کی فکروں نے گھیرا......'' اماں بے حد ملول ہوئیں' ''بیٹے پر خرچہ ہو تو جی کو تسلی تو ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں یہ ہمیں کھلائے گا...... بیٹے کے خرچوں سے بھی خوشی ہوتی ہے...... خیر! جو اللہ کی مرضی!''

واجد کی بند آنکھوں میں مستقبل کے خواب بننے لگے۔ وہ چشم تصور سے خود کو انجانے بوجھ تلے دبا ہوا دیکھنے لگا۔ اماں کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

نرس کی آمد سے اس کے خیالات میں تعطل پیدا ہو گیا۔ وہ بچی لے آئی تھی۔ اس نے اسے اماں کی گود میں ڈال دیا اور خود مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔

واجد نے آنکھیں کھولیں۔ آف وہائٹ کمل میں لپٹا ننا سا وجود اماں کی گود میں تھا۔ اماں اپنی کہی ہوئی ساری باتیں بھول کر اب بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ واجد کو بچی نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف اس کا ننھا منا گلابی تلوا اسے دکھائی دیا۔ جیسے کسی گڑیا کا پیر ہو۔ اسکے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اٹھ کر اماں کے قریب آ گیا۔ چھوٹے سے گلابی' گول چہرے پر لمبی لمبی کالی پلکیں تھیں۔ وہ بے حد پیاری بچی تھی اپنی ماں کی طرح وہ بھی آنکھیں موندے بے خبر سو رہی تھی۔

''سمیہ ہے اس کا نام!'' اماں بولیں' میں نے سوچا تو ''حمزہ'' تھا۔ خیر...... جو اللہ کی مرضی!''

آپریشن کی وجہ سے صبیحہ کو تین' چار دن ہسپتال میں ہی رہنا پڑا۔ واجد کا سارا سیٹ اپ بگڑ گیا تھا۔ اماں کو ہر حال میں صبیحہ کے پاس ہی رہنا تھا۔ بچی کو سنبھالنا تھا۔ گھر پر کوئی نہ تھا۔ جو اس کے کھانے پینے کا اور دیگر ضروریات کا خیال کرتا۔ اسے آفس سے چھٹی لینا پڑ

گئی۔ صبح شام وہ ہوٹل سے کھانا لے کر ہسپتال پہنچتا تھا۔ جہاں وہ تینوں کھانا کھاتے۔

صبیحہ کا میکہ دوسرے شہر میں تھا۔ اس کے گھر والوں کو اس نے اطلاع کر دی تھی مگر تا حال کوئی نہ پہنچا تھا۔ اس روز صبیحہ کو ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونا تھا۔ واجد اس کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ جب اسے سجاد مل گیا۔ سجاد بھی اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رک گئے۔

''تم یہاں کیسے؟'' دعا سلام کے بعد واجد نے پوچھا۔

''میری بیوی ایڈمٹ ہے بیٹا ہوا ہے'' سجاد کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ماجد نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں کیک کی کئی ڈبے تھے۔

''میری بھی بیوی ایڈمٹ ہے...... بیٹی ہوئی ہے!'' واجد نے بتایا

''اچھا! مبارک ہو......'' سجاد سرسری بولا۔

دونوں ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ واجد کمرے میں آیا تو صبیحہ بچی کو فیڈ کروا رہی تھی۔ اماں سامان سمیٹ رہی تھیں۔ انہیں سامان سمیٹتا ہوا دیکھ کر واجد کو خوشی اور سکون کا احساس ہوا۔ اسے کسی قید سے رہائی کا احساس ہوا۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ بچی کو ایک نظر دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''گھر چل کر میں مٹھائی لے آؤں گا۔'' عزیز رشتہ داروں میں بانٹنے کے لئے۔''

''ہائیں؟'' اماں نے برا سا منہ بنایا۔ ''پہلے کم پیسے خرچ ہوئے ہیں جو ایک نیا خرچہ سوچ رہا ہے۔ ایسی کون سی خوشیاں بری ہیں...... لڑکیوں کی کون مٹھائی بانٹتا ہے؟''

واجد نے صبیحہ کے بجھتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور یوں ظاہر کیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ دل میں اس نے سوچا کہ واقعی' خرچہ تو پہلے ہی بہت ہو گیا تھا!

❁ ❁ ❁

وہ گھر پہنچا تو نصیر میز پر کھانے کے برتن رکھ رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر نصیر نے سکون کا سانس لیا۔

''کہاں رہ گئے تھے صاحب؟ میں کب سے راہ تک رہا تھا۔''

''یہاں جانا ہے میں نے نصیرا!'' اس نے چھڑی جگہ پر ٹانگی اور ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی۔ ''یونہی ذرا پارک تک چلا جاتا ہوں......... سیر بھی ہو جاتی ہے' جوڑ بھی مل جل لیتے ہیں اور پھر دل بہل جاتا ہے......... تم کیوں میری راہ تکتے ہو؟ کھانا کھا لیا کرو......''

''واہ صاحب! اچھی کہی...... '' نصیر نے برا مانا'' دو بندے ہیں گھر میں...... وہ بھی کھانا الگ کھائیں...... جو رہی سہی برکت ہے' وہ بھی جاتی رہے۔''

''کیا پکا لیا ایسا؟'' وہ ہنسنے لگا۔ ''بڑے چہک رہے ہو؟''

''کیا پکانا ہے نصیر خان نے؟'' وہ بے نیازی سے بولا'' دن بھر میں ایک ہانڈی پکا لیتا ہوں کون سا تیر مارتا ہوں...... آج مارکیٹ گیا تھا۔ پائے اچھے مل رہے تھے۔ سوچا لے لوں۔ دو پائے لے آیا...... یہ ڈھیر سارا سالن بن گیا ہے۔ چار دن کھائیں گے......''

''چار دن؟ ہا...... آ...... '' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔'' تم دس دن کھلاؤ یار...... یہاں کس کو اعتراض ہے؟ جی کا بہلاوا ہے سب...... چار دن اور جاتے ہیں پھر......''

آگے وہ جان بوجھ کر کھانسنے لگا تھا۔ نصیر باورچی خانے میں گیا تو وہ اٹھ کر کارنر ریک تک چلا آیا۔ فریم میں جڑی تصویر میں چار بچیاں مسکرا رہی تھیں۔ اس نے بے اختیار ایک بچی کے رخسار پر انگلی پھیری۔ دل سے ایک ہوک اٹھی۔

''سب چلی گئیں...... سب......'' آنکھ سے ایک قطرہ ٹپکا اور اس کے داڑھی کے بالوں میں گم ہو گیا۔

''پاپا!''

وہ چونک اٹھا۔ جلدی سے ادھر ادھر دیکھ کر اس نے آنکھیں قمیض کی آستین سے پونچھ ڈالیں۔ نصیر کنکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا سالن کا ڈونگا میز پر رکھ رہا تھا۔

''آ جائیں صاحب...... کھانا ٹھنڈا ہو گیا تو مزہ نہیں دے گا!''

''میں مزے کے لئے کہاں کھاتا ہوں نصیرا!'' وہ بھی میز تک چلا آیا۔

فون کی بیل بج اٹھی تھی۔ •

''میں دیکھتا ہوں!'' نصیر اٹھنے لگا۔

''نہ نہ...... نہ......'' وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھا تھا۔

رستے میں پڑی میز سے اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی۔ پھر بھی وہ چوٹ کا درد چھپا

فون تک بے تابی سے پہنچا'' ہیلو......'' اس نے ریسیور اٹھایا۔

''پاپا......'' یہ آواز اس نے چند لمحے پیشتر تصور میں سنی تھی

''سفیہ بیٹی...... کیسی ہو!'' اس کی آواز میں خوشی تھی اور درد کا احساس بھی۔

''میں ٹھیک ہوں پاپا...... آپ کیسے ہیں؟''

''فرسٹ کلاس...... خوش باش...... آہ!'' اس نے گھٹنا تھاما۔

''یہ آپ کراہ کیوں کر رہے ہیں......'' وہ فکر مند ہو گئی۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ پھر سے بخار تو نہیں ہو گیا۔'' ''نہیں نہیں...... بس وہ ذرا سا میز کا کونا لگ گیا ہے گھٹنے میں...... میں ٹھیک ہوں!''

''اوہ پاپا...... آپ بالکل اپنا خیال نہیں رکھتے۔ یہ میز کہاں سے آ گئی گھٹنے تک؟ آپ ہی دیکھ کر نہیں چلتے۔ اب کتنے دن درد رہے گا۔ پہلے ہی ہڈیوں کا پرابلم ہے آپ کو...... پاپا' آپ بالکل اپنا خیال نہیں رکھتے۔ یہ نصیر کہاں ہے؟ آپ اس سے کیوں نہیں کام کرواتے؟''

''اوہو...... بچے کیوں فکر کر رہی ہو...... میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں......''

''پاپا...... مجھے بہت فکر رہتی ہے آپ کی......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''اچھا...... بچے کیسے ہیں؟'' اس نے موضوع بدلا'' مجھے یاد کرتے ہیں؟''

''بہت یاد کرتے ہیں۔ ریا تو ہر وقت آپ کی باتیں کرتی ہے۔''

''اور چھوٹو؟''

''وہ بھی......'' وہ مختصراً بولی۔

''آ کب رہی ہو...... آ کر مل جاؤ باپ سے......'' اس کا مدعا بالآخر لبوں تک آ ہی گیا۔

''میں آؤں گی پاپا...... بہت جلد''

''اچھا بیٹے...... اللہ حافظ!''

اس نے فون بند کر دیا اور آنکھوں میں آتی نمی صاف کرتا میز تک چلا آیا۔ اچانک ہی اسے بہت بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ نصیر کے بنائے ہوئے پائے اس نے بے حد شوق سے کھائے اور تعریف بھی کی۔

آفس میں اس نے دو طرح کا رویہ بے حد شدت سے محسوس کیا۔ سجاد کو بھی لوگوں نے بہت پر جوش انداز میں مبارک باد دی تھی۔ مٹھائی کے تقاضے ہوئے تھے۔ دوست احباب اس کے گھر پھل لے کر پہنچے تھے۔ جبکہ واجد کے ساتھ سب کا رویہ یونہی سرسری سا تھا۔ بیٹی کی مبارک باد اسے سب نے دبے دبے سے انداز میں اس طرح دی جیسے اس کے برا مان جانے کا خدشہ ہو۔ کسی نے اس سے مٹھائی کی فرمائش نہ کی۔ کوئی دوست اس کے گھر نہ آیا۔ واجد کو اب سے پہلے کبھی اس بات کا خیال نہ ہوا تھا۔ صبیحہ کی پریگننسی کے دوران اس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اس کے ہاں لڑکا ہونا چاہئے یا لڑکی۔ صبیحہ اکثر اس سے پوچھا کرتی کہ اس کی کیا خواہش ہے۔ وہ ہنس کر خاموش ہو جایا کرتا۔

لیکن پہلی بچی کی پیدائش پر ہی معاشرے کا جو ردعمل اس کے سامنے آیا اس سے اس کے دل میں بیٹے کی خواہش ابھری پھر چند ہی دنوں میں ایک نخل سے تناور درخت کی صورت اختیار کر گئی۔ سفیہ کی پیدائش سے جھک جانے والے کاندھوں کو اٹھا کر چلنے کا جی چاہنے لگا۔

"خواہش تو مجھے بھی ہے واجد......" وہ بولی "لیکن ڈاکٹر کہتی تھی آپریشن کے بعد گیپ زیادہ ہونا چاہئے۔ آئندہ ہم اس ڈاکٹر سے کیس نہیں کروائیں گے......"

صبیحہ خاموش ہو گئی۔ بیٹی پیدا کر کے وہ بھی خود کو مجرم سا محسوس کرتی تھی۔ اس نے واجد کی فرمائش کے سامنے زیادہ جرح نہی کی۔

چند ماہ میں نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی خوش ہو گئے۔ نئے سرے سے خواب بننے لگے۔ اماں کے نحیف و نزار وجود میں بھی دوبارہ جان پڑ گئی۔ وہ دوڑی بھاگی کسی مولوی سے تعویز بنوالائیں اور صبیحہ کے گلے میں ڈال دیا۔ صبیحہ وہ تعویز پا کر بے حد خوش ہوئی۔ گویا مولوی نے اسے پکا پکا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا۔ گویا وہ لڑکے کی ماں بن گئی تھی۔

اماں اور صبیحہ نے سارے کپڑے نئے بنوائے۔ بھلا لڑکا کہاں لڑکیوں کی سی فراکیں پہن کر اچھا لگتا اماں ہر دکان دار سے لڑکے کی استعمال کی اشیاء طلب کرتیں۔

"ارے یہ لال ٹوپا کیوں دے رہا ہے بھائی...... ہلکے رنگ کا دے۔"

"یہ گڑیوں کی چھپائی والا کپڑا؟ میں بچے کی چادر گڑیوں والی بناؤں؟" دماغ درست ہے؟"

صبیحہ واجد کو اگی باتیں بتاتی۔ دونوں میاں بیوی خوب ہنستے۔

چھوٹی سفیہ قدم قدم چلنے لگی تھی۔ وہ واجد کے آگے پیچھے پھرا کرتی۔ واجد کو اس سے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ وہ دن بھر میں ایک آدھ مرتبہ اسے گود میں اٹھا کر پیار کر لیا کرتا تھا پھر جیسے اس کا فرض پورا ہو جاتا تھا۔ کبھی وہ باہر جانے کی ضد کرتی۔ اسے واجد کی گود میں چڑھ کر محلے کے دکان سے چیز خریدنے کا بے حد شوق تھا۔ واجد نے کبھی اس کی یہ فرمائش پوری نہ کی۔ اسے سفیہ کو گود میں لے کر باہر لے جانے میں شرم محسوس ہوتی تھی۔

"لڑکا ہوتا تو لے بھی جاتا۔" وہ دل میں سوچتا "فخر تو ہوتا"

سفیہ ڈیڑھ برس کی بھی نہ ہوئی تھی۔ جب ثانیہ چلی آئی۔ وہ بھی سیزرین کا نتیجہ تھی۔ واجد اور اماں دم بخود رہ گئے۔ واجد کا جی چاہ رہا تھا یہ اطلاع سنانے والی نرس کی پٹائی کر ڈالے۔ بہت دیر تک وہ جھکے ہوئے کاندھے اور ستا ہوا چہرہ لے کر بیٹھا رہا۔ اماں ٹھنڈی آہ بھر کر بچی کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی تھیں۔

بچی لڑکوں والے کپڑے پہنے ہلکے رنگ کی چادر میں لپٹی مزے سے مسکرا رہی تھی...... اپنی "سرپرائزنگ" آمد پر یا ان لوگوں کے بے بسی پر یا اوپر والے کی مصلحت پر ...... جانے کس بات پر!

واجد کو اس مرتبہ بہت مایوسی ہوئی تھی!

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ صحن میں چلا آیا۔ وہاں بچھی چارپائی پر لیٹ کر تارے گننا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ آسمان کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ چاند، تارے، سفید جالی کے سے نرم نرم، باریک بادل جو کبھی چاند کا چہرہ ڈھانپ دیتے، کبھی کھول دیتے۔ اسی آسمان تلے اس نے عمر بتا بھی دی تھی اور اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی!

اسے آسمان پر اماں نظر آتیں۔ مسکراتی ہوئی، اسے اشاروں سے اپنے پاس بلاتی ہوئی اماں...... پھر اسے صبیحہ نظر آتی۔ اداس اداس مسکراہٹ والی صبیحہ۔ اس کی نگاہوں میں

ایک نامحسوس سی شکایت ہوتی۔ وہ اسے پاس نہ بلاتی تھی۔ بس دبی دبی مسکرائے جاتی۔ غمزدہ سی مسکراہٹ۔

اسے احساس ہوتا' ایک دن اس کا چہرہ بھی اس طرح آسمان کا کوئی دریچہ کھول کر جھانکتا ہوگا۔ وہ بھی نیچے دیکھ دیکھ کر مسکرائے گا۔ اشارے کرے گا......

"کون سمجھے گا میرے اشارے؟" اسے خیال آتا "کس کے لئے جھانکوں گا میں؟"

فریم میں جڑی تصویر میں مسکراتے چار چہرے اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اس کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ چلی آئی۔ اس نے آنکھیں موندیں تو دو قطرے اس کی گردن تک چلے گئے۔ اسے ثانیہ کی یاد آئی۔ سفیہ بیاہ کر دوسرے شہر گئی تھی۔ لیکن ثانیہ یہیں' اس شہر میں تھی۔ وہ اکثر آیا کرتی تھی۔ اس کے تین بچے تھے جو گھر میں ادھم طوفان مچا ڈالتے۔ دو بیٹے' ایک بیٹی۔ اسے ثانیہ کی سب سے چھوٹی' اکلوتی بیٹی لائبہ بہت عزیز تھی۔ وہ اسے اٹھائے اٹھائے پھرتا۔ اس کا منہ چومتا۔ وہ اس سے بھاگتی تھی۔ اسے دیکھ کر چھپنے لگتی۔ اسے اپنے نانا کچھ خاص پسند نہ تھے۔ لڑکے شرارتی تھے۔ وہ اس کی چیزیں چھیڑا کرتے۔ وہ اکثر انہیں ڈانٹ دیا کرتا تھا' "ایک تو یہ لڑکے...... کتنے شریر ہوتے ہیں......" وہ اکثر عاجز ہو کر کہتا اسکی بیٹیاں ہنسا کرتی تھیں!

✿ .... ✿ .... ✿

رات گئے اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ سینے میں درد اٹھنے لگا۔ اس نے نصیر کو دو چار آوازیں دیں تو وہ آنکھیں ملتا چلا آیا۔

"صاحب...... خیر تو ہے......" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا۔

"نصیر...... وہ میری گولیاں...... زبان کے نیچے رکھنے والی......" وہ بمشکل بول پایا۔

نصیر دوڑا بھاگا گیا۔ اس کی گولیاں لے آیا۔ شیشی سے گولی نکال کر اس کے منہ میں رکھی۔ پھر اس کی پشت سہلانے لگا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس عالم میں اسے خدا کے بعد صبیحہ کی یاد آئی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ ہوتی تو شاید اس تنہائی اور تکلیف کا اتنا احساس نہ ہوا کرتا۔ وہ ساتھ ہوتی تو وقت بالکل علیحدہ شکل کا ہوتا۔ ایک دوسرے کے سہارے وہ بڑھاپے اور تکلیف کی سب سرحدیں ساتھ طے کرلیتے۔

نصیر کون تھا؟ محض ایک دیرینہ ملازم...... بھلا ملازم کے سہارے موت کی سرحد عبور کرنا کوئی آسان بات تھی؟ ایسے عالم میں تو کسی بہت "اپنے" کا ہاتھ ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے! اسے اماں کا آخری وقت یاد آیا۔ اس کے دل کی دھڑکن معمول پر آنے لگی۔ پھر اسے صبیحہ کا...... اس کی سفید پلکوں والی آنکھیں سلگنے لگیں۔

"صبیحہ...... صبیحہ" اس کا دل پکارنے لگا۔

نصیر بیٹھا اس کی پشت سہلا رہا تھا۔

"تم جاؤ نصیر۔" وہ بھیگی آواز میں بولا۔ "میں ٹھیک ہوں اب۔ تم آرام کرو جاکر۔"

"صاحب...... "آپ چلے کیوں نہیں جاتے وہاں؟" نصیر دبی دبی آواز میں بولا

"نہیں نصیر...... بہت اچھی گزر رہی ہے...... اس سے زیادہ کی مجھے کبھی خواہش نہیں...... چار دن اور جاتے ہیں۔ اور پھر......" اسے کھانسی آگئی۔

"تم جاؤ نصیر!"

اس کے اصرار پر ناچار نصیر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اسے صبیحہ کی یاد آرہی تھی۔ وہ تنہائی میں صبیحہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

زندگی میں اسے صبیحہ سے کچھ زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ اماں کی پسند تھی۔ شادی سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ شادی کے بعد وہ شروع شروع میں اس سے کترایا کرتا جھینپا جھینپا سا رہتا۔ اماں کا میاں بیوی کا سر جوڑے رہنا پسند نہ تھا۔ نہ ہی وہ بیوی کا زیادہ دیر میاں کے پاس بیٹھنا پسند کرتی تھیں۔ سو آفس سے لوٹ کر وہ اکثر دوستوں سے ملنے باہر چلا جاتا۔ صبیحہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ پھر بچوں کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ اور بھی مصروف ہوگئی۔ واجد سر پر آپڑنے والی ذمہ داریوں میں گم ہوگیا۔

دونوں نے شناسا اجنبیوں کی مانند سفر گزار دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو کھوجنے یا دریافت کرنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے آنکھوں میں بجھے ہوئے دیے جلانے کی کوشش

نہ کی۔ نگاہوں کے پانیوں پر سفر کر کے دل کے خزانے تک پہنچنے کی زحمت نہ کی۔

اسے اب اکثر خیال آتا تھا۔ غلطی اس کی تھی۔ ذات سے ذات تک کا سفر شروع کرنے میں پہل ہمیشہ مرد کو کرنی چاہیے۔ صبیحہ بات کا آغاز نہ کرتی۔ خاموشی سے اس کا استری شدہ جوڑا نکال کر غسل خانہ میں لٹکا دیتی وہ نہا دھو کر کمرے میں آتا تو گرم گرم کھانا اس کا منتظر ہوتا۔ وہ کھانا کھاتا۔ صبیحہ اس دوران کمرے میں ایک دو چکر لگا جاتی۔ اگر وہ اس سے بات کرتا تو وہ خوشدلی سے مسکرا کر جواب دیتی۔ اور اگر وہ دفتر کی کسی الجھن میں گم، خاموشی سے کھانا کھائے چلا جاتا تب وہ بھی اسے مخاطب نہ کرتی۔ شاید اس نے نکاح نامے میں اپنی ذات کے تمام تقاضوں سے دستبردار ہونے کی شرط بھی از خود لکھ لی تھی۔ اور چپکے سے اس پر سرِ تسلیم خم کر لیا تھا۔

اسے اب اکثر اپنی غلطی کا احساس ہوتا تھا۔ اسے زرخیز مٹی ملی تھی۔ اس نے کبھی اس پر گلستان سجانے کی کوشش نہ کی۔ عورت فطرتاً محجوب ہوتی ہے۔ واجد نے کبھی اس کے اس جذبے کی تسکین کرنے کی کوشش نہ کی۔ روٹی، کپڑا، مکان اور دیگر ضروریات کی فراہمی...... اس نے صبیحہ کا اتنا ہی حق سمجھا۔ حق کے علاوہ عورت کا مان بھی بہت کچھ ہوتا ہے، اس نے احساس نہ کیا۔

صحن میں بے مقصد لیٹ کر لمبی راتوں کو تمام کرنے کی کشٹ میں اسے اب اکثر یہ خیال ستاتا تھا۔ اس نے کبھی صبیحہ کے ہمراہ چاندنی راتیں، باتیں کر کے بتانے کا اہتمام کیوں نہ کیا۔ اس نے تو کبھی صبیحہ سے اتنا بھی نہ کہا۔

''دیکھو صبیحہ! پورا چاند کتنا خوبصورت لگ رہا ہے...... بالکل تمہاری طرح!''

اب اسے وہ سب باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے کبھی صبیحہ سے نہ کیں۔ جو باتیں اس نے چند سالوں کی ہم سفری میں صبیحہ سے کیں، وہ اسے بالکل یاد نہ تھیں۔ بھلا وہ باتیں کہاں یاد رہ جانے کے قابل تھیں؟

''وہ...... ڈاکٹر...... آپ کو بلا رہی ہے!'' صبیحہ شرماتی، جھجکتی لیڈی ڈاکٹر کے چیمبر سے نکل کر اس کے قریب آ کر بولی تھی۔

''مجھے؟'' واجد کو حیرانی ہوئی۔ ''مجھے کیوں بلا رہی ہے؟''

''پتہ نہیں!'' صبیحہ بولی۔

لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے پتہ تھا۔ واجد کو کوفت ہوئی۔ عورتوں سے بات کرنے کے معاملات میں وہ صفر تھا۔ اسے تو کبھی اپنی بیوی سے بات کرنا نہ آئی تھی۔ بمشکل وہ ڈاکٹر کے چیمبر میں جا کر اس کے مقابل بیٹھا۔

''مسٹر واجد...... سوا دو سالوں میں تین میجر آپریشن! اس کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟'' ڈاکٹر خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے گویا ہوئی ''آپ کو اپنی بیوی کی زندگی عزیز نہیں ہے کیا؟''

''جی...... وہ......'' اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

''پڑھے لکھے شخص ہیں آپ...... آپ کو تو سب باتوں کا پتہ ہونا چاہیے۔ دو سیزیرین کے بعد آپ کو کم از کم تین سے چار سال کا گیپ درکار تھا...... اس پریگننسی سے آپ کی مسز کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے...... ارے ابھی تو اس کے اسٹیچز بھی پوری طرح سے خشک نہیں ہوئے......''

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''بہر حال...... ایک زندگی کی بنیاد پڑ گئی ہے...... میں اسے ختم کرنے کا گناہ تو اپنے سر نہیں لے سکتی لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ اس تیسرے آپریشن کے ساتھ ہی آپ بچے بند کروانے کا آپریشن بھی کروا لیں۔ اس عورت میں مزید سکت نہیں ہے......''

واجد کو ڈاکٹر کی بات بے حد بری لگی لیکن اس نے وہاں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ صبیحہ کو لے کر گھر آ گیا۔

''پھر کیا سوچا آپ نے؟'' صبیحہ نے پوچھا تھا۔

''سوچیں گے......'' اس نے بات ٹال دی۔

سفیہ اور ثانیہ کے بعد وہ کم از کم دو بیٹے چاہتا تھا۔ بچے بند کروانے کا مطلب تھا زیادہ سے زیادہ ایک بیٹا...... اور پھر اس مرتبہ نجانے کیوں اسے وہم تھا کہ صبیحہ پھر لڑکی کو جنم دے گی۔ وہ کوئی رسک مول لینے کے موڈ میں نہ تھا۔ اماں پوتا کھلانے کی آرزو جی میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی رخصت کے سمے اس کے دل میں بھی اس کی خواہش یونہی سسکتی رہ جائے۔ وہ بیٹے کا باپ بننا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش جنون بن چکی تھی۔ اس نے کیس کسی ایسی ڈاکٹر سے کروانے کا فیصلہ کیا جو اسے ایسا برا مشورہ نہ دے!

''بیٹی ہوئی ہے!'' سسٹر نے اطلاع دی۔

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس سے سر اٹھا کر یہ جملہ کہنے والی کو دیکھا تک نہ گیا۔

''آپ کی مسز کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بلڈ کا ارینج منٹ کریں!''

اس مرتبہ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ کچھ دیر وہیں اسی کیفیت میں بیٹھا رہے کوئی اس سے بات نہ کرے۔ اسے کسی کی بات کا جواب نہ دینا پڑے۔ اسے اٹھنا نہ پڑے چلنا نہ پڑے کوئی صبیحہ اور اس کی بچی کو اٹھا کر گھر پہنچا دے۔ وہ کسی کا ذمہ دار نہ ہو۔

لیکن ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ اپنے کنبے کا ذمہ دار وہ خود تھا! سو وہ ہمت کر کے اٹھا اور بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گیا۔

صبیحہ ہوش میں آ کر بہت روئی تھی۔ اس نے بچی کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ واجد صبیحہ کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ اس سے ضرورتاً بات کر رہا تھا گویا سب کیا دھرا اسی کا تھا۔

بچی صبیحہ کی گود میں آئی تو صبیحہ کے دل کو قرار آ گیا۔ وہ اپنی سب تکلیف بھلا کر اسے دودھ پلانے لگی۔ اور بچی کا پیٹ بھر جانے پر اس نے غلطی سے اس کا منہ بھی چوم لیا۔ پھر واجد کو دیکھ کر وہ خفیف سی ہو گئی۔ واجد کو اپنے رویے کی بدصورتی کا بالآخر کچھ احساس

ہوا۔ وہ اٹھ کر صبیحہ کے قریب چلا آیا۔

''ارے...... یہ تو بہت پیاری ہے!'' وہ بولا۔

صبیحہ ہنس دی۔ بچی بے حد صحت مند اور خوبصورت تھی۔

''اس کا نام کیا ہو؟''

''حمزہ!'' صبیحہ ہنس دی'' ہر مرتبہ میں یہی نام سوچتی ہوں۔ اماں کی خواہش تھی نا!''

''اچھا! تو حمنیٰ رکھ لیتے ہیں......'' واجد بولا'' اماں کی خواہش کچھ تو پوری ہو......''

دونوں میاں بیوی ہنس دیئے تھے۔

''میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے صبیحہ......'' واجد کچھ دیر ٹھہر کر بولا تھا'' وہ پہلی ڈاکٹر تو یونہی بکواس کر رہی تھی۔ یہ ڈاکٹر کہتی ہے چھ آپریشن بھی ہو سکتے ہیں...... سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے۔''

''پتا نہیں واجد...... مجھے ڈر بہت لگتا ہے...... شاید میری قسمت میں بیٹا دیکھنا نہیں ہے!'' صبیحہ اداسی سے بولی۔

''کیوں نہیں...... مایوس کیوں ہوتی ہو...... اگلی مرتبہ بیٹا ہی ہوگا...... مجھے یقین ہے!''

''اگلی مرتبہ!'' صبیحہ سہم گئی۔

پھر اس نے سر جھکا لیا تھا۔

❁ ❁ ❁

اس کی طبیعت ساری رات خراب رہی تھی۔ ساری رات وہ جاگتا رہا تھا۔ روتا رہا تھا۔ نجانے کیوں اسے صبیحہ یاد آتی تھی تو وہ رونے لگتا تھا۔ وہ خود کو مجرم تصور کرنے لگتا تھا۔ ہر چند کہ صبیحہ نے آخری دم تک اس سے کبھی کسی بات کی شکایت نہ کی تھی۔ اسے وہ سب یاد آتا جو صبیحہ نے اسے دیا تھا۔ اپنی زندگی کی بہترین سال' بے مثال رفاقت' بے لوث خدمت' اپنی صحت' اپنی زندگی...... اور اولاد! صبیحہ نے اسے سب کچھ دیا تھا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا کہ اس نے جواب میں صبیحہ کو کیا دیا؟ اسے کچھ یاد نہ آتا۔ وہ تو اسے ذہنی تحفظ تک نہ دے

پایا تھا۔ صبیحہ خود کو غیر محفوظ تصور کرتی تھی کیونکہ وہ ہر مرتبہ بیٹی کو جنم دیتی تھی اور واجد کو بیٹے کی خواہش تھی۔ اس نے اٹھ کر فجر کی نماز کے لئے وضو کیا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ آنکھیں ساری رات سلگی تھیں۔ کمرے میں آ کر اس نے بتی جلائی اور حسب عادت ریک میں رکھی تصویر تک چلا آیا۔ سفیہ' ثانیہ' حمنٰی اور رمنا...... اس نے محبت سے ان چاروں کو دیکھا۔ سبھی خوبصورت تھیں۔ لیکن سب سے چھوٹی رمنا! وہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ جیسے صبیحہ نے دوسرا جنم لے لیا ہو۔ اسے سب ایک سی عزیز تھیں' وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا لیکن اس کا دل چپکے سے بے ایمانی کرتا۔ رمنا' رمنا پکارے جاتا۔

اس کا جی چاہا وہ رمنا کی پیشانی پر بوسہ دے۔ اسے محبت نے تڑپا کر رکھ دیا۔ رمنا تو سب سے دور تھی وہ بیاہ کر انگلینڈ گئی تھی۔ سفیہ دوسرے شہر میں تھی۔ ثانیہ اور حمنٰی یہیں اسی شہر میں تھیں۔ فرصت ملنے پر دوڑی آتی تھیں۔

آنکھیں آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے جاء نماز بچھائی اور نیت باندھ لی۔ خدا کے حضور حاضر ہوتے ہی سب کچھ دھندلا گیا۔ خواب و خیال ہو گیا۔ بس خدا تصور باقی رہ گیا۔

جب عمر کی نقدی تمام ہونے لگے تو زندگی کے سبھی دھندے بے مصرف ہو جاتے ہیں۔ سب خواہشیں طاق نسیاں میں دھرے بے کار' پرانے چراغوں کی مانند اپنی قیمت کھو چکی ہوتی ہیں۔ کسی شے کی کچھ اہمیت باقی نہیں رہتی۔ سکندر دنیا سے کیا لے گیا؟

نماز پڑھ کر اس نے ہاتھ بلند کئے تو روشن' چمکتی پیشانیاں پھر سے یاد آئیں۔ اس نے اپنی اولاد کے لئے بڑے خشوع و خضوع سے بہت سی دعائیں مانگیں۔ ڈھیری خوشیاں' نعمتیں' رحمتیں' برکتیں وہ سبھی کچھ مانگتا چلا گیا۔

جاء نماز لپیٹ کر اس نے جگہ پر رکھ تو گھٹنے کا درد پھر سے پریشان کرنے لگا۔

"یہ اخیر عمر کی چوٹیں......" وہ گھٹنا سہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔ "کم بختیں کتنی وفا شعار بنتی ہیں ارے یہاں کون ہے تمہاری ناز برداری کے لئے...... جاؤ چھوڑو میری جان!"

وہ اٹھ کر پھر ریک تک چلا آیا۔ یکا یک اس کی نگاہ کلینڈر پر جا ٹھہری۔ اس کا دل لمحہ بھر کو دھڑکنا بھول گیا۔

"پندرہ اکتوبر؟ میں بھول گیا؟ میں کیسے بھول گیا؟ آج پندرہ اکتوبر ہے۔ اور میں بھول گیا؟" آج صبیحہ کی پچیسویں برسی تھی۔

"آہ!" اس کے دل میں پھر ٹیس اٹھی۔

رات والا درد جو بے حد مشکلوں سے گیا تھا پھر سے لوٹنے لگا۔ آج کا دن تو بہت گزرنا تھا۔

صبیحہ کی یاد اسے پل پل تڑپاتی تھی۔ اس کا جانا اب تک تمام جزئیات سمیت اس کے حافظے میں درج تھا۔

اسے آپریشن تھیٹر لئے جا رہے تھے۔ اسٹریچر ذرا کی ذرا واجد کے نزدیک رکا تھا۔ زرد رو صبیحہ کی آنکھوں میں نجانے کیوں آنسو تھے۔

"واجد...... میری بچیوں کا خیال رکھنا!" وہ بس اتنا ہی بولی تھی۔

واجد نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن اسٹریچر آگے بڑھ گیا تھا۔ واجد کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند کاندھے جھکائے وہیں کھڑا رہا تاوقتیکہ ایک نرس نے آ کر اسے اس کی زندگی کی بدترین خبر سنا دی۔ اس مرتبہ صبیحہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ بے ہوش ہونے کے چند لمحوں بعد ہی اس کے دل کی دھڑکن رک گئی تھی۔

"اس عورت میں اتنی سکت نہیں ہے......" ایک ڈاکٹر کے کہے ہوئے الفاظ پھر ساری عمر اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔

وہ جانتا تھا۔ اپنی جنونی خواہش کے ہاتھوں اس نے اپنی صبیحہ کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

وہ اس کا قاتل تھا۔ وہ مجرم تھا۔

ہر سال صبیحہ کی برسی پر وہ اپنے جذبات کا نئے سرے سے شکار ہوتا تھا!

بیٹیاں رحمت ہیں۔ صبیحہ کے بعد اسے صحیح معنوں میں اس بات کا ادراک ہوا۔ اس کے چند سال نہایت مشکل سے کٹے پھر جونہی سفیہ نے شعور کی دنیا میں پہلا قدم رکھا' واجد کی زندگی سہل ہوتی چلی گئی......

وہ اس کی بیٹی تھی جو ایک فکر مند ماں کی طرح اس کے آرام کا' اس کے کھانے پینے کا' اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایک مخلص ساتھی کی طرح اس کا الجھنوں اور پریشانیوں کا سبب جاننے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

ایک کے بعد ایک وہ باشعور ہوتی چلی گئیں۔ اس کے اردگرد بلبلیں چہکا کرتی تھیں۔

''پاپا...... کھانا لے آؤں؟''

''پاپا...... چائے پئیں گے؟''

''آپ سوئے نہیں اب تک؟ آپ کے سر میں تیل لگا دوں؟''

''پاپا...... یہ شرٹ میلی ہے۔ یہ نہ پہنیں...... میں دوسری استری کر دیتی ہوں......''

''پاپا...... آپ بالکل اپنا خیال نہیں رکھتے!''

اور پھر ایک کے پیچھے دوسری...... وہ تتلیوں کی مانند اس کے گلستان سے رخصت ہو گئیں!

وہ تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا!

''صاحب! آخر آپ اس کی بات مان کیوں نہیں لیتے؟ آپ چلے کیوں نہیں جاتے؟'' نصیر اس سے پوچھتا۔

''نہیں نصیر......'' وہ کہتا ''میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہاں میری بیٹیاں ہیں نصیر...... میری بلبلیں۔ میں جب تک زندہ ہوں' ان کے لئے تحفظ کا احساس ہوں۔ ایسا سائبان ہوں جس کی آغوش ان کے خوش رہنے اور اپنے خالی رہنے کی دعا کرتی ہے...... پھر بھی نصیر...... سائبان کا احساس تو ہونا چاہئے نا؟'' بیٹیاں اپنے میکے کے ذکر سے کتنا خوش ہوتی ہیں...... میں تو ان کا مائکہ ہوں...... میں ان کی ماں ہوں...... ان کا باپ ہوں......''

وہ بولتا ہی چلا جاتا۔ نصیر لاجواب ہو جاتا تھا۔

''آہ!'' اس نے اپنی چوٹ سہلائی۔

جی چاہتا تھا' محبت بھرے ہاتھوں کا لمس اس چوٹ کو سہلائے' اسے احساس دلائے کہ کوئی ہے! مگر وہ تھا اور اس کی تنہائی تھی...... اس کے آنسو تھے!

دوپہر تک نصیر نے اس سے کچھ کھانے کے لئے اصرار کیا پھر مجبور ہو کر کھانا کھا کر سو گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا' وہ پارک میں چلا جائے۔ وہاں جا کر اپنی مخصوص سنگی بنچ پر بیٹھ کر وہاں کھیلتی ہوئی بچیوں کو دیکھے۔ انہیں دیکھ کر خوش ہو۔ اپنا آپ بھولنے لگے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ گھٹنے کی چوٹ منہ زوری کر رہی تھی۔ سوجن ہونے لگی تھی۔

وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ بھوک کی وجہ سے اس پر کمزوری غالب ہونے لگی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''پاپا! آپ آ جائیں......''

''نہیں حمزہ! میں نہیں آ سکتا......''

''پاپا...... کیوں بے کار کی ضد باندھ کر بیٹھے ہیں...... آخر اس پس ماندہ ملک میں رکھا ہی کیا ہے؟ یہاں آ کر دیکھیں' زندگی کیا چیز ہے...... ترقی کسے کہتے ہیں...... مہذب معاشرہ کیسا ہوتا ہے......''

''اس پس ماندہ ملک میں میری جڑیں ہیں حمزہ...... جو بہت گہری ہیں...... یہاں میری بیٹیاں ہیں جو بہت زیادہ مؤدب اور مہذب ہیں...... یہاں میری ماں...... اور تمہاری ماں کی قبر ہے وہ ماں جو تمہیں جنم دے کر خود موت کی وادی میں جا بسی...... وہ ماں' جس سے تمہیں کوئی دلی لگاؤ نہیں ہے...... اگر ہوتا تو تم کبھی اسے چھوڑ کر نہ جاتے......''

''اوہ پاپا...... آپ کو کون سمجھائے!''

''مجھے مت سمجھاؤ حمزہ......'' وہ بڑبڑایا ''مجھے مت سمجھاؤ...... میں نے کبھی کچھ نہیں سمجھا۔ کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی!''

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ہونٹ کانپنے لگے۔

دھڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ وہ اچھل کر رہ گیا۔

''پاپا...... السلام علیکم......'' کورس میں کہا گیا تھا۔ ''سرپرائز......''

وہ دم بخود رہ گیا۔ زندگی کے سبھی رنگ ایک ساتھ چمک اٹھے تھے۔ خوشیوں نے ایک ساتھ اس کے گھر کا رستہ دیکھا تھا۔ ان سب کو اپنی ماں کی برسی یاد تھی۔

وہ چاروں اپنے بچے لئے چلی آئی تھیں۔

سفیہ' ریبا اور چھوٹو کو لئے ہوئے تھی۔

ثانیہ' رائبہ' عمر اور اشعر کے ساتھ تھی

حمنیٰ کی گود میں مریم تھی۔

اور رمنا کی گود میں فہد تھا۔

وہ بھیگتی آنکھوں کو میچ میچ کر کبھی کسی کو دیکھتا' کبھی کسی کو۔ اس کی ہنسی رو کے نہ رکتی تھی وہ چاروں اس پر جھک گئی تھیں۔ اس کے بال' اس کی داڑھی کو چوم رہی تھیں۔

سفیہ دوڑ کر آیوڈکس اٹھا لائی تھی اور اب اس کے گھٹنے پر مالش کر رہی تھی۔

ثانیہ گرم پانی کی بوتل لینے دوڑ گئی تھی۔ حمنیٰ اور رمنا کھانا گرم کر رہی تھیں۔ ان کے بچے پورے گھر میں طوفان مچا رہے تھے۔

اور وہ چاروں اور دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ہنس رہا تھا۔ اس کے گلستان میں بہار آئی ہوئی تھی۔ اس کی بلبلیں چہک رہی تھیں اور تتلیوں کے سبھی رنگ اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے!

ایسی عورت

دروازے کی کنڈی بجی تو ببلو پر بے دھیانی میں ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی ماہ بانو چونک اٹھی، اس قدر بھری دوپہر میں نجانے کون آ گیا تھا۔ وہ غنودگی کے زیر اثر بال سمیٹتی دروازے تک چلی آئی اور کنڈی گرا کر دروازہ کھولا۔ پھر وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

نگاہوں میں ہوس اور ہونٹوں پر بھیگی بھیگی مسکراہٹ سجائے مرید باہر کھڑا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے بناء جھجکے چہرہ اندر گھسا لیا تھا۔ وہ اسے بے باکی سے تک رہا تھا۔

''جج............ جی .... جی............ وہ گھبرا کر خود میں سمٹنے لگی۔''

''ببلو؟'' وہ مسکراہٹ مزید گہری کر کے بولا۔

پیلے دانت نمایاں ہو گئے۔ نگاہوں کی ہوس مزید چمکنے لگی۔

''ببلو تو سو رہا ہے!'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اٹھا کر لے جاؤں؟'' وہ سرگوشی میں بولا۔

ماہ بانو نے گھبرا کر سر اٹھایا تھا۔ نجانے اس نے ببلو کے لئے ہی پوچھا تھا یا............

''مم...... میں لا دیتی ہوں۔'' وہ بولی اور مڑ کر بستر تک چلی آئی جہاں دو سالہ ببلو محو خواب تھا۔ ماہ بانو نے اس کے ماتھے پر سے بال سمیٹے اور اسے بہت احتیاط سے اٹھایا مبادا اس کی نیند خراب ہو جائے پھر وہ اسے بانہوں میں بھر کر دروازے تک چلی آئی۔

مرید اس اثناء میں اندر آ چکا تھا۔ ماہ بانو نے ببلو کو اس کی جانب بڑھایا۔ مرید نے اپنے ہاتھوں کو پہلے ماہ بانو کے بازوؤں پر پھیرا پھر اس کے چونکنے پر جلدی سے ببلو کو

تھام لیا۔

''ہی ہی ہی......'' اس نے بے وجہ ہی دانتوں کی نمائش کی تھی' ''بہت سب ہے تم سے...... ہی ہی ....بلو کو ....رہ نہیں سکتا تمہارے بغیر...... ہے نا!''

ماہ بانو کچھ نہ بولی۔ مرید کی ذلیل حرکت نے اس کے اندر چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔ وہ نظروں کو اٹھائے بغیر خفا خفا تیوروں سے مرید کے باہر نکلنے کی منتظر تھی۔

''اچھا بانو! چلتا ہوں...... کنڈی لگا لے...... ہیں!'' وہ مسکراتا ہوا باہر نکلا۔

اس کے جانے کے بعد ماہ بانو نے کنڈی لگائی اور واپس آ کر بستر پر لیٹ رہی۔ کچھ دیر قبل دوپہر کا کھانا کھانے سے جو نیند کا غلبہ ہو رہا تھا وہ یک لخت ہی غائب ہو چکا تھا۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ جانے کیسا تضاد تھا۔ یہ...... جانے قدرت کی کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ بلو کو جس قدر چاہتی تھی اس کا باپ مرید اس کے لئے اتنا ہی ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔

مرید کی نظروں کی ہوس ناکی' ہونٹوں کی وہ خبیث مسکراہٹ اور ہاتھوں کے ناپاک عزائم اس کے لئے نئی بات نہ تھی۔ بلو کی محبت میں وہ سال بھر سے یہ سب کچھ برداشت کئے جا رہی تھی۔ اسے بلو کی ماں زبیدہ پر بہت غصہ آتا تھا۔ جب وہ خود بلو کو چھوڑ کر جاتی تھی تو اسے لینے کے لئے بھی آ سکتی تھی۔ نجانے کیوں ہر مرتبہ وہ مرید کو ہی بھیج دیا کرتی تھی۔ ماہ بانو گھر پر اکیلی ہوتی تھی اور وہ وقت بے وقت آن دھمکتا تھا۔ شکیل' بانو کا شوہر مستری تھا۔ وہ صبح کام کے لئے نکلتا تو رات کو ہی لوٹتا تھا جبکہ مرید کی اپنی پرچون کی دکان تھی۔ وہ جب جی چاہتا دکان کا شٹر گرا کر محلے کی گلیوں میں مٹر گشت کرتا پھرتا۔

ماہ بانو بے اولاد تھی اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ اس نے ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر حکیموں اور دائیوں سے بھی علاج کرایا لیکن سب بے سود رہا تھا اس کی بانجھ کوکھ ہری نہ ہو سکی۔ پھر وہ مایوس اور نامراد ہو کر بیٹھ رہی۔ شادی کو چھ سال ہونے کو آئے تھے جب ممتا کے درد سے بوجھل بانو کو بلو مل گیا۔ بلو' زبیدہ کی ساتویں اولاد تھا۔ اس سے پہلے زبیدہ کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ بلو کو سنبھالنے کا وقت زبیدہ کے پاس نہ تھا۔ سال بھر کا بلو ریں ریں کرتا پوری گلی میں مارا مارا

پھرتا تھا۔

ایک روز ماہ بانو کا دروازہ کھلا پا کر وہ گھر کے اندر چلا آیا' بانو' جو چکی پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی تمنا چپکے سے اس کی ہتھیلی پر تتلی بن کر آ بیٹھی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھی' ہاتھ دھوئے اور جا کر بلو کو گود میں اٹھا کر چومنے لگی۔ پھر اس نے بلو کو نہلایا اس کے کپڑے دھو کر' سکھا کر' استری کر کے اسے پہنائے۔ نرم دلیہ پکا کر اس کے خالی پیٹ کو بھرا پھر سوئے ہوئے بلو کو پیار کر کے زبیدہ کو مطلع کرنے اس کے گھر چلی گئی۔

زبیدہ بے پروا عورت تھی۔ اسے علم تک نہ تھا کہ اتنی دیر سے بلو' ماہ بانو کے ساتھ ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ماہ بانو کو بچہ مل گیا اور بلو کو ماں کا حقیقی پیار اور توجہ میسر آ گئی۔ سال بھر کا بچہ اس کا دروازہ پہچان گیا وہ روز گھر سے نکلتا اور بانو کے پاس چلا آتا۔ بانو اسی کی منتظر ہوتی۔ بلو کو دیکھ کر اس کی ممتا کھل اٹھتی۔ وہ اسے نہلاتی دھلاتی' کھانا کھلاتی پھر پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر اسے سلا دیتی تھی۔

بات یہیں تک محدود رہتی تو خوب تھا۔ لیکن ایک دن ان کے معصوم پیار کی بھنک شیطان کے کانوں میں پڑ گئی۔ محبت کی شیرینی میں ہوس اور نفرت کی کڑواہٹ گھلنے لگی۔

ایک دن مرید بلو کو لینے آ گیا۔ گرمی کے خیال سے بانو نے گلی میں کھلتا دروازہ وا کر کے آگے پردہ لٹکایا ہوا تھا۔ خود وہ نہا کر نکلی تھی۔ گیلے بال سکھاتی' بے پروا بانو تب چونکی' جب اس نے پردے کے عقب سے مرید کی مکروہ نگاہوں کو دیکھا۔ وہ نجانے کب سے وہاں کھڑا اسے تولیے سے بال سکھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

مرید بلو کو لے کر چلا گیا۔ اور بانو کی پرسکون زندگی میں اضطراب کی لہریں چھوڑ گیا۔ اب وہ روز ہی بلو کو لینے آن دھمکتا تھا۔ نگاہوں سے کام نہ چلتا تو وہ ایک آدھ معنی خیز فقرہ فضا میں گند گھولنے کو اچھال دیتا تھا اور موقع ملتا تو بانو کو چھو بھی لیتا تھا اور پھر بے نیازی سے مڑ جاتا۔ ماہ بانو شرم اور غصے سے بھر کر رہ جاتی لیکن وہ اسے کچھ کہنے سے ڈرتی تھی۔ وہ بلو کا باپ تھا اور بانو بلو کی محبت میں دیوانی ہو چکی تھی۔ جس روز وہ اسے نہ دیکھ پاتی' اس روز جیسے کانٹوں پر لوٹا کرتی تھی۔ مرید ماہ بانو کی مجبوری کو سمجھ چکا تھا اور حرام خور

گدھ کی طرح اس کے گرد چکر کاٹا کرتا تھا۔

شکیل گھر لوٹا تو ماہ بانو مضطرب اور بے کل تھی۔ دوپہر کا واقعہ اس کی یادداشت سے محو نہ ہو سکا تھا۔ اسے بار بار اپنے بازو پر کوئی بچھو سا رینگتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

شکیل نے کھانا کھانے کے دوران اور بعد میں ٹی وی دیکھتے ہوئے بھی اسے ذہنی طور پر غیر حاضر پایا تو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''بانو!'' اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''کیا بات ہے؟ میکہ یاد آ رہا ہے؟''

''نہیں تو!'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''لے پگلی! رو رہی ہے......'' شکیل نے اسے خود سے قریب کیا۔ ''چل بتا اب...... کیا بات ہے؟''

''میرے نصیب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں اس قدر ہی بول سکی۔

''کیا ہوا تیرے نصیبوں کو؟ تو تو بڑی بھاگوان ہے...... جس دن سے آئی ہے میری زندگی میں...... بس خوشیاں ہی خوشیاں ہیں...... روزگار کی فکر نہیں' گھر در اپنا ہے' روزی میں برکت ہے...... اور کیا چاہئے؟ تو کیوں فکر کرتی ہے!''

''اصل دولت...... جو ایک عورت اپنے مرد کو دیتی ہے...... وہی نہ دے سکوں میں......'' وہ منہ ڈھانپ کر رو دی۔

''ری پگلی...... میں نے کبھی گلہ کیا؟ کوئی شکوہ سنا تو نے کبھی میرے منہ سے؟ اور تیرے اختیار میں جو بات نہیں اس کا گلہ تجھ سے کیوں کروں؟''

''پھر بھی شکیل...... اپنے ہاں ایک بچہ ہو جاتا...... ہر طرح سے سکھی ہو جاتی میں...... یوں دوسروں کے گھروں میں نہ جھانکنا پڑتا نہ دوسروں کو ہمارے گھر میں جھانکنے کا حوصلہ ہوتا......''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' شکیل مشکوک ہوا۔

ماہ بانو نے فوراً ہی آنسو پونچھ لئے۔ جو اگر شکیل کو بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ نہ صرف مرید بلکہ بہلو کا داخلہ بھی اس گھر میں ممنوع قرار دے دیتا۔

''کچھ نہیں...... ہونا کیا ہے......'' وہ بولی ''بس میں دن رات ایک بچے کے

لئے ترستی ہوں...... شکیل ہم یتیم خانے سے کوئی بچہ لے لیں؟''

''پاگل ہوئی ہے!'' شکیل جھنجلا گیا ''دوسروں کا خون ہمارا کیسے بن سکتا ہے۔ جو محبت اپنی اولاد سے ہوتی ہے اس کی بات اور ہے بے وقوف...... تو حوصلہ رکھ...... اللہ نے چاہا تو ہمارے آنگن میں بھی ضرور روشنی ہوگی۔''

''ہر مرتبہ تو رپورٹ خراب ہی آئی ہے...... یہی لکھا ہوتا ہے نا اس میں کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی...... بتا...... پھر تجھے کیسی آس ہے؟''

''اچھا چل اب سو جا!'' شکیل ٹی۔ وی بند کر کے نیم دراز ہو گیا ''زیادہ زور نہیں دیتے دماغ پر......''

چند لمحوں میں وہ خراٹے بھر رہا تھا۔ ماہ بانو حسرت سے اس کو تکتی رہی۔ ایسی میٹھی اور ایسی سچی نیند اسے نہ آتی تھی۔ آدھی آدھی رات تک جاگتے میں اور بقیہ رات سوتے میں وہ ننھے منھے بچوں کے سپنے دیکھا کرتی تھی...... اسے شکیل پر رشک آتا تھا جو ہر طرح کی فکر اور پریشانی سے آزاد تھا۔ وہ شکیل کی اس خوبی کی معترف تھی۔ جو اس کے پاس نہیں تھا۔ اسے اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ اپنے حال میں مطمئن اور خوش تھا۔ پھر ماہ بانو جی جان سے اس کی قدر بھی کرتی تھی۔ اس نے کبھی بانو کو بانجھ ہونے کا طعنہ نہ دیا تھا۔ بانو نے اس کے منہ سے یہ بات کبھی نہ سنی تھی۔ شاید یہ ماہ بانو سے اس کی بے تحاشا محبت کا ثبوت تھا۔

مجھے تیرے سوا کچھ نہیں چاہئے پگلی!'' وہ اکثر اس سے کہتا۔ 'جب تو میرے ساتھ ہوتی تو میں ہر غم بھول جاتا ہوں...... مجھے صرف تو یاد رہ جاتی ہے۔۔!''

وہ ماہ بانو کا دیوانہ تھا۔ بانو کے سوا اسے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا لیکن بانو اس وقت سے ڈرتی تھی جب ہر مرد کی طرح شکیل کے دل میں بھی وارث کی خواہش جنم لیتی۔

✿ .... ✿ .... ✿

بہلو کے لئے اس کی محبت کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ جانتی تھی' کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے اردگرد مکمل اندھیرا تھا۔ بہلو اس اندھیرے میں روشنی کا احساس تھا۔ ماہ بانو بھلا کیوں نہ پروانہ بن کر اس کے گرد ناچتی۔

اس نے مرید کی نگاہوں سے ٹپکتی ہوسناکی کو نظرانداز کر دیا۔ اس کے بڑھتے

ہاتھوں کی ناپاک خواہش کو وہ اکثر جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی ببلو کا باپ ہونے کے ناطے وہ ببلو کو ماہ بانو سے ملنے سے روک بھی سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی حرکتوں کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر چپ چاپ پی جایا کرتی تھی۔ شکیل سے وہ اگر اس معاملے کا ذکر کرتی تو نتیجہ یہاں بھی اس کی اور ببلو کی جدائی کی صورت میں ہی نکلتا۔ سو ماہ بانو یہاں بھی اپنے لئے کوئی راستہ نہ پاتی۔

اس روز وہ ببلو کو سلا کر خود نہانے کے لئے غسل خانے میں گھس گئی کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلی تو اس کی نگاہ دروازے کی کنڈی پر پڑی۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ شاید جلدی میں وہ ہی لگانا بھول گئی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ ایک ہاتھ اس کے پیچھے سے آ کر اس کے لبوں پر سختی سے جم گیا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اسے گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔

ماہ بانو نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی چیخیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ شیطان نجانے کس رستے سے معصوم کدے میں گھس آیا تھا۔ بدقستی نے نجانے کس روزن سے جھانکا تھا۔ نقب کیونکر لگی تھی۔ ماہ بانو سمجھ نہ سکی۔

مرید اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو کر فرار ہو گیا تھا۔ ماہ بانو اپنا سسکتا وجود اور زخمی روح لئے تڑپتی رہی۔ گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔ وہ ایسے مقام پر تھی کہ کسی سے دو بول ہمدردی کے بھی نہ مانگ سکتی تھی۔ حال دل کس سے کہتی؟ لٹنے کا ماجرا کسے سناتی؟

ببلو اٹھا تو بانو نے اسے جی بھر کر پیار کیا پھر اسے گھر سے نکال کر کنڈی لگالی۔ ببلو ہی وہ روزن تھا جہاں سے لیٹرے کو گھر میں گھسنے کا اشارہ ملا تھا۔ بانو کو لٹ کر عقل آئی تھی۔ سب کچھ گنوا کر خود کو محفوظ رکھنے کا خیال آیا تھا۔

شکیل کے آنے سے پہلے ہی وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ لیٹرے کے گھر میں در آنے کا ہر سراغ مٹا چکی تھی۔ شکیل کا استقبال اس نے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر کیا۔

شکیل اس کی مسکراہٹ کی مرذنی کا راز نہ جان سکا!

ببلو روز آتا لیکن بانو اس کے لئے دروازہ نہ کھولتی۔ وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے

دروازہ بجاتا۔ بانو کے کانوں میں جیسے پگھلا ہوا سیسہ گرتا۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا۔ روح سسکتی۔ وہ دروازہ نہ کھولتی۔ ببلو باہر کھڑا روتا رہتا۔ ماں، ماں، پکارتا، بانو نے اسے 'ماں' کہنا سکھایا تھا۔ بانو اندر بیٹھی رویا کرتی۔ اس کا رواں رواں 'ببلو' 'ببلو' پکارتا' پھر بھی وہ اسے اندر آنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ببلو روزن تھا اور اس معصوم روزن سے ایک شیطان کی آنکھیں اس کے گھر میں جھانکا کرتی تھیں سو بانو مجبور تھی!

یونہی کتنے ہی دن گزر گئے۔ ببلو نے مایوس ہو کر دروازہ بجانا چھوڑ دیا۔ تاہم وہ لاچار سا گلی میں پھرا کرتا تھا۔ ماہ بانو کبھی کبھار کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھ لیا کرتی تھی...... ببلو کی جھلک پا کر اس کے دل میں کیل سی گڑ جاتی۔ وہ تڑپ کر رہ جاتی۔

اس روز شکیل کام پر نہ گیا تھا۔ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ ماہ بانو اس کے لئے روٹی پکا رہی تھی۔ کہ یکایک اس کو بڑے زور کا چکر آیا۔ پھر اسے متلی محسوس ہوئی۔ وہ لپک کر گئی اور غسل خانے میں جا کر الٹیاں کرنے لگی۔

شکیل اس کی آواز سن کر لپک کر چلا آیا تھا۔

"بانو...... کیا ہوا ہے بانو......" وہ اسے سنبھالنے لگا۔

بانو کی طبیعت شام تک نہ سنبھلی تو وہ پڑوس کی عورت کو بلا لایا جو محلے کی عورتوں کو ہلکے پھلکے امراض کی دوا دے دیا کرتی تھی۔

"اے بی! مبارک ہو......" دائی ماں بولی تھی "خیر سے ماں بننے والی ہو!"

ماہ بانو کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ تحیر سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کیا کہہ رہی ہو اماں..........." شکیل غرایا تھا۔ 'دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔"

"اے لو!" دائی ماں حیران بھی ہوئی اور خفا بھی "میاں چالیس سال سے یہ کام کر رہی ہوں۔ اس کو پیٹ نہ ہو تو جو سزا چور کی وہ میری۔"

دائی ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ ماہ بانو کا چہرہ خوشی کے مارے گلنار ہو گیا تھا۔ اس نے شکیل کی آنکھوں میں اترتا ہوا خون نہ دیکھا۔

"شکیل.......... شکیل.......... سنا تم نے.......... میں ماں بننے والی ہوں...... تم باپ بننے والے ہو.........."

''حرافہ!'' شکیل زور سے چلایا' ''بتا...... کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے تو نے...... بدکار......''

''شکیل!'' ماہ بانو لرز کر رہ گئی' ''یہ کیا کہہ رہے ہو......''

شکیل نے ایک موٹی لکڑی اٹھائی اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔

''جان سے مار ڈالوں گا حرام زادی...... مجھے پاگل بناتی ہے...... بتا کون ہے وہ...... جس کا گناہ کوکھ میں لئے بیٹھی ہے تو......''

شکیل پر خون سوار تھا۔ بانو جان بچاتی گلی میں نکل آئی۔ محلے والے بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ایک زمانہ اس کی رسوائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

چند لوگوں نے بانو کو بچانے کی کوشش کی تو شکیل نے انہیں بھی پیٹ ڈالا۔

''میں باپ نہیں بن سکتا لوگو...... سنا تم نے......'' وہ چلا رہا تھا' ''میں باپ نہیں بن سکتا اور یہ ماں بننے والی ہے...... ایسی بدکار' فاحشہ کو مار نہ ڈالوں میں......''

بانو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ شخص چھ سالوں سے اسے یہ یقین دلا رہا تھا کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی اور آج اپنی خامی کا اعتراف کر کے بھی وہ سرخ رو تھا۔

شکیل لکڑی پھینک کر گھر میں گھس گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لوگ باتیں بناتے' فقرے کستے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ زخمی اور مجروح بانو کی دلجوئی کو کوئی تیار نہ تھا۔

''چل زبیدہ اندر......'' مرید کی آواز پر بانو نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

وہ تنفر سے اسے دیکھتا ہوا اپنی بیوی کو گھر کے اندر لے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں میں حقارت اور تمسخر تھا۔ شاید وہ بھی اسے بدکار اور فاحشہ سمجھ رہا تھا۔

''ایسی عورتوں کا یہی انجام ہوتا ہے......'' وہ زبیدہ کو گھر کے اندر لے گیا اور بڑے زور سے دروازہ بند کر لیا۔

''ایسی عورت......''

''ایسی عورت......''

''ایسی عورت......''

ماہ بانو کی نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان گھوم رہے تھے۔ دنیا اس کے اردگرد چکرا رہی تھی۔ مرید جیسے شخص کی زبان سے یہ بات سننے کے بعد پھر کسی شئے کی کچھ حقیقت نہ رہی تھی۔

''ماں...... ماں......''

بانو نے دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے قریب بیٹھے ببلو کو پہچاننے کی کوشش کی جو اس کے بازو پر اپنا سر رگڑ رہا تھا۔

''ببلو!'' اس کے لبوں سے سسکی نکلی۔

''ماں...... ماں......'' ببلو مچل رہا تھا۔

''ببلو......'' ماہ بانو نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔

''ایسی عورت...... ایسی عورت......'' مرید کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''فاحشہ...... بدکار......'' شکیل چلا رہا تھا۔

''ماں...... ماں......'' ببلو تکرار کئے جا رہا تھا۔

دور کہیں ٹرین چلائی تھی۔ ماہ بانو نے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا اور ببلو کو اپنی اوڑھنی میں چھپا کر چل دی!

Fantacy

کھڑکی کھولتے ہی وہ یوں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی تھی جیسے اس نے کھڑکی میں کسی ناگن کو دیکھ لیا ہو' شاید اس نے ناگن کو ہی دیکھا تھا یا پھر کسی ناگن کی ناگن سی چوٹی پر اس کی نگاہ پڑی تھی۔

وہ خوفزدہ ہو کر پلٹ گئی تھی اور وسیم کی رائیٹنگ ٹیبل تک چلی آئی تھی۔ رائٹنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے شیشے کے نیچے وسیم کی پاسپورٹ سائز تصویر پڑی تھی۔ ماہرہ کی نظریں تصویر میں وسیم کی نظروں سے ملیں۔ اسے یوں لگا جیسے تصویر میں وسیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ہو اور اس میں معنی در آئے ہوں۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ پھر وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر سوچنے لگی کہ شاید اس نے جو کچھ دیکھا وہ نظر کا دھوکہ تھا۔ شاید اس نے کسی دوسرے فلیٹ کی کھڑکی دیکھی۔ شاید اس نے غلط سمجھا' حقیقت کچھ اور تھی۔ شاید وہ ثمائلہ نہیں' کوئی اور تھی!

کیا مشکل ہے! شوہر کی محبوبہ کا سامنا کرنا کیسا اذیت ناک مرحلہ ہے...... وہی عورت سمجھ سکتی ہے جس کے شوہر کی کوئی محبوبہ ہو اور اس سے سامنا بھی ہوا ہو۔

ماہرہ ڈرتے ڈرتے پھر کھڑکی تک گئی۔ شک شبہات کے سب بلبلے ہو گئے۔ یقین کی سطح ہموار ہو گئی ثمائلہ اپنی کھڑکی میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ جس میں اس کا چاندنی سا بدن دور سے بھی دمکتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی ناگن سی چوٹی اس کے سینے پر پڑی تھی اور اس کے لبوں کی وہ منہ چڑاتی مسکراہٹ ماہرہ کو اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ تڑپ کر وہاں سے ہٹ گئی اور کسی ہاری ہوئی جنگ کے شکست خوردہ بادشاہ کی طرح سر ایک طرف کو گرا کر کرسی پر بیٹھ رہی۔

کس قدر مطمئن ہو گئی تھی زندگی۔ وقت کی شاہراہ پر مسرور و مصروف انداز میں رواں دواں تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ وسیم کی بے مہری میں واضح کمی آئی تھی۔ اب وہ اکثر اس سے مسکرا کر بات کرتا تھا۔ کبھی کبھار اسے گھمانے پھرانے کے لئے باہر بھی لے جاتا تھا۔ گھر لوٹتے وقت اس کے ہاتھوں میں پھلوں کے لفافے ہوتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو وہ پکا پکایا کھانا بھی لے آتا تھا۔ ماہرہ کو اس کو اچھے رویے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کا سابقہ رویہ اس کی یادداشت سے محو ہو چلا تھا۔ اور...... اور......سال بھر ہی گزرا تھا کہ وہ پھر سے اسی کھڑکی میں نظر آ رہی تھی۔

ماہرہ کو خیال آیا۔ وہ کتنی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ نیلا رنگ اس پر کس قدر اٹھ رہا تھا۔ گزرا سال اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ پایا تھا۔ وہ ویسی ہی شگفتہ اور دلکش تھی۔

پھر وہ جلدی سے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ براؤن رنگ کے کپڑوں میں اس کا بے رونق چہرہ مزید بے رونق لگتا تھا۔ اسے بے حد مایوسی ہوئی۔ حد درجہ جھنجلاہٹ سوار ہوئی۔ اسے خود پر غصہ آیا۔ آخر اسے رنگوں کا صحیح انتخاب کرنا کیوں نہ آیا تھا۔ ہر مرتبہ کپڑوں کی شاپنگ کے وقت وہ یہ بات بھول جاتی تھی کہ اسے کس طرح کے رنگ پہننا چاہئیں۔

ڈل براؤن' ڈارک میرون' ڈارک گرین' بلیک' مرے ہوئے چوہے کا سا گرے......

اسے اپنی الماری کھول کر بے حد افسوس ہوا۔ ایک سے ایک بے کار رنگ بھرا ہوا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وسیم کے آفس سے لوٹنے سے پہلے نہا دھو کر کوئی بہت فریش' کھلتا ہوا سا رنگ پہنے۔ ایسا رنگ جس کا عکس اس کے چہرے کی بے رونقی کو ڈھانپ لے جو اس کے اندر کی اچھائی کو پورے طور پر نمایاں کر دے جو اسے پورے گھر میں چلتے پھرتے اس طرح فوکس کر دے کہ وسیم کو کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے کا خیال نہ آئے۔ اگر وہ کھڑکی کھول دیتا اور سامنے والی کھڑکی میں کھڑی ثمائلہ کو نیلے رنگ کا لباس پہنے ہوئے دیکھ لیتا تو............تو............ آگے اس کی سوچ کی پرواز میں دم نہ رہا۔ وہ بے جان پروں کے

بوجھ کے ساتھ ماہرہ کے کاندھوں پر آ گری۔

پھر اس کا جی چاہا وہ سر پر پٹی باندھ کر بستر پر پڑ جائے۔ اور اس قدر ہائے وائے کرے کہ وسیم اس کے سرہانے سے ہی نہ اٹھے۔ اس کا ذہن ماہرہ کی بیماری میں اس قدر الجھ جائے کہ اسے کھڑکی کا خیال تک نہ آ سکے............ لیکن............ لیکن............ وسیم تو ذرا سی طبیعت خرابی میں سب سے پہلے تازہ ہوا کی فراہمی کے لئے وہ کھڑکی ہی کھولتا تھا۔ ماہرہ کو بستر پر دیکھ کر تو وہ ضرور سب سے پہلا کام کھڑکی کھولنے کا کرتا اور پھر وہ اس کی بیماری اور صحت سے متعلق ہر بات فراموش کر دیتا۔ شائلہ کو دیکھ کر! پھر اسے خیال آیا' کیوں نہ وہ اس کھڑکی کے پٹوں میں کیلیں ٹھونک دے۔ اسے کوئی تختہ لگا کر ہمیشہ کے لئے بند کر دے............ لیکن یہ خیال تو سب سے زیادہ ناقابل عمل تھا! بھلا وہ اپنے اس عمل کی وسیم کے سامنے کیا توجیہہ پیش کر سکتی تھی؟

سب سے آخر میں اسے اپنی ماسٹرز کی ڈگری یاد آئی! ماہرہ کا جی چاہا کہ وہ اپنی ڈگری نکال کر دیکھے۔ آخر کیوں؟ کیوں اس نے وہ ڈگری حاصل کی تھی؟ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن...... ماہرہ شیخ۔ ایک قبول صورت' سانولی رنگت کی لڑکی...... جو ازدواجی زندگی کے دو سال گزارنے کے بعد بھی اپنے شوہر کی اجنبیت سے خوفزدہ تھی۔ اپنے شوہر کے گھر میں ہوتے ہوئے وہ ایک ایسی لڑکی سے خوفزدہ تھی جو محض دور سے اس گھر کی صرف ایک کھڑکی کے کھلنے کی منتظر رہتی تھی۔ موجودہ وقت پر دسترس رکھتے ہوئے وہ آنے والے وقت کے بے معنی اندیشوں سے خوفزدہ تھی............ کیوں...... کیوں............؟

وہ ایک مرتبہ پھر آئینے کے مقابل چلی آئی اور اپنی مایوس اور خوفزدہ نظروں سے اپنا چہرہ کھوجنے لگی۔ اسے احساس ہوا' وہ زیادتی کر رہی تھی' وہ اپنے چہرے کے ساتھ زیادتی کر رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ بھی اپنے نظر سے دیکھنے کے بجائے وسیم کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اسے کم از کم اپنے چہرے کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ وہ چہرہ اس کا تھا! اس پوری دنیا میں وہ اپنے چہرے کو وسیم کی نگاہ سے دیکھتی؟ اس کی خامیاں تلاشتی' اس کی خوبیوں سے نگاہ چراتی' وسیم اگر اس میں خامیاں ڈھونڈتا ہے تو ڈھونڈتا پھرے۔ وہ اگر اس چہرے کا موازنہ شائلہ کے چہرے سے کرتا ہے تو ہزار بار کرے...... وہ چہرہ وسیم کا چہرہ تھوڑا ہی ہے جو

اسے اس چہرے سے محبت یا انس ہو۔ لیکن ماہرہ کی نگاہوں کو ایسا کرنا زیب نہ دیتا تھا۔

اس نے بہت پیار سے اپنے سانولے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ اور محبت سے اپنی زرد آنکھوں میں جھانکا بچپن میں وہ بہت بیمار رہی تھی' یہ اس نے اپنے بڑوں سے سنا تھا۔ لمبی بیماری نے اس کے جسم کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ اور بہت لمبے عرصے کے لئے وہ سینک سلائی سی رہی تھی۔ پھر جوانی آئی تو بدن تو پھر بھی مارے خوشی کے کچھ بھر بھرا گیا لیکن چہرہ ویسا کا ویسا ہی رہا۔ وہ سانولی رنگت اور مردہ آنکھوں والی ایک ذہین لڑکی تھی۔ یونیورسٹی میں اس کی ذہانت کے چرچے تھے' وہ اپنے ٹیچرز کی منظور نظر تھی۔ لیکن نجانے کیا بات تھی؟ وہ بہت خود اعتماد نہ تھی۔ بات کرتے' جھجکتی' لڑکوں سے کتراتی۔ شاید اس کے لاشعور میں اپنی کم روئی کا گلہ چھپا ہوا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح شگفتہ اور شاداب نظر نہ آتی تھی۔ پھر اسے پہننے اوڑھنے کا کچھ ایسا خاص ڈھنگ بھی نہ تھا۔ وہ عموماً ایسے رنگوں کا انتخاب کر لیتی تھی جو پہننے کے بعد بالکل بھی نہ اٹھتے تھے۔ شاید یہ اس کی ڈل شخصیت کا کرشمہ تھا جو وہ ایسے ڈل کلرز منتخب کر لیا کرتی تھی۔

اس کا جی چاہا وہ بسنتی رنگ کا جوڑا پہنے یا پھر جوگیا رنگ کا دوپٹہ اوڑھے یا فیروزی رنگ کا کرتا اور سفید شلوار پہنے۔ اس کا جی فالسئی رنگ پہننے کو مچلا۔ دھانی رنگ پہننے کو تڑپا اس کی نظر میں قوس و قزح کے رنگ چمکے۔ آہ! الماری میں براؤن اور میرون کا راج تھا۔ گرے اور ڈارک مسٹرڈ رنگ کے کئی جوڑے تھے۔ وہ جو بھی جوڑا منتخب کرتی اس کے ذہن میں نیلے رنگ کے کپڑے زیب تن کیے شائلہ آ کھڑی تھی۔

اس کی نگاہ گھڑی پر گئی۔ وسیم کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لئے زیادہ وقت نہ تھا۔ بادل نخواستہ اس نے مسٹرڈ رنگ کا ایک لباس منتخب کیا اور غسل خانے میں گھسنے سے پہلے مین ڈور کا لاک کھول دیا۔ وسیم اگر اس کے غسل کے دوران آ جاتا تو باہر کھڑا پریشان ہوتا رہتا۔

نہانے کے دوران وہ پژمردگی کا شکار رہی۔ اچھا بھلا سو کر اٹھی تھی۔ پوری دوپہر کی نیند کے بعد ذہن تازہ دم ہو گیا تھا۔ کیفیات خوشگوار تھیں۔ وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر کچن میں چائے بنانے کے لئے جانا چاہتی تھی۔ جب ساری خوشگوار کیفیات یکا یک ہی جسم

ہو گئی تھیں۔ اور اب وہ بے دلی سے نہاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وسیم سے بھلا یہ بات کتنے عرصے تک چھپی رہ سکتی تھی' جلد یا بدیر اسے شائلہ کی آمد کا علم ہو جانا تھا پھر نجانے ماہرہ سے اس کا رویہ پھر بدل جاتا یا ویسا ہی رہتا' وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ ایک خوش امیدی یہ بھی کی جا سکتی تھی کہ شاید شائلہ کی آمد کا علم ہی نہ ہو پائے۔ یہ خیال تسکین بخش تھا! نہا کر کپڑے پہنتی ماہرہ کی کیفیات پھر خوشگوار ہونے لگیں۔ اسے چائے کی پیالی کی طلب ہوئی۔ وہ اب کچن میں جا کر چائے بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

غسل خانے کا دروازہ کھول کر وہ جونہی باہر نکلی اسے یوں لگا جیسے سانپ کی بجائے وہی ناگن اسے سونگھ گئی ہو جسے اس نے کھڑکی میں دیکھا تھا! وسیم کھڑکی کھولے کھڑا تھا۔ اس کی پشت ماہرہ کی جانب تھی۔ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر جمائے وہ باہر کیا دیکھ رہا تھا' ماہرہ خوب جانتی تھی! پھر بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے قریب چلی آئی۔

وسیم! آپ کب آئے؟"

وسیم چونک کر مڑا۔ اس کی نظروں میں ماہرہ کے لئے اجنبیت تھی اور لبوں پر چند لمحے قبل والی مسکان کا سراغ تھا۔ ماہرہ کو اس کے عقب میں سامنے والی بلڈنگ کے اس فلیٹ کی کھڑکی نظر آئی۔ وہاں نیلے لباس کی جھلک تھی۔ اس کے لبوں سے فریاد کے سے انداز میں ایک آہ نکلی۔ پھر وہ چائے بنانے کے لئے کچن کی جانب چل دی!

شب روز ایک مرتبہ پھر بدل گئے تھے۔ ستاروں نے شاید پھر چال بدلی تھی۔ ماہرہ کے لئے وہی دن پلٹ آئے جب وہ نئی نئی شادی کے بعد اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کر رہی تھی۔ وسیم پھر سے وہی وسیم بن گیا تھا۔ جس کے انداز میں خشونت' نگاہوں میں اجنبیت اور لہجے میں کرختگی تھی۔ وہ آفس سے جلد لوٹ آتا اور گھر آتے ہی بے حد بے تابی سے اپنی فائل میز پر پھینکتا ہوا کھڑکی کی جانب بڑھتا۔ ماہرہ کے لٹکائے ہوئے دبیز پردوں کو وہ ایک ہی جھٹکے میں ایک طرف ہٹا دیتا اور پھر کھڑکی کھول کر گہری سانس بھرتا اور مسکراتا۔ اس کی سانس میں طمانیت اور مسکراہٹ میں جاذبیت ہوتی تھی۔ اس کے عقب میں ماہرہ بھی ایک گہری سانس بھرتی تھی۔ اس سانس میں جذبوں کے جلنے کی بو ہوتی تھی۔ خوابوں کے

لوٹنے کی کراہ ہوتی تھی۔ وسیم کو نہ تو کچھ جلنے کی بو محسوس ہوتی اور نہ ہی کچھ ٹوٹنے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ وہ کرسی کھڑکی کے سامنے ڈال لیتا اور پھر رات تک وہیں بیٹھا رہتا تھا۔ ماہرہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمرے کے چکر کاٹتی اور بہانوں بہانوں سے اسے مخاطب کرتی۔ اس کا دھیان بٹانے کی اپنی سی سعی کیا کرتی لیکن وسیم کی توجہ سامنے والی بلڈنگ کی اسی کھڑکی کی جانب مرتکز رہتی جہاں شائلہ روز نئے نئے اور نت نئے رنگوں کے کپڑے بدل بدل کر سامنے پھرا کرتی۔

شائلہ کے پاس پہننے کے لئے بہت خوبصورت رنگوں کے کپڑے تھے۔ اپنی دمکتی رنگت کے لحاظ سے وہ سرخ جامنی' نیلا اور سبز رنگ خوب پہنا کرتی۔ وہ زیادہ دیر کھڑکی میں نہ ٹھہرتی تھی بلکہ ہر تھوڑی دیر بعد ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جایا کرتی۔ کبھی وہ دونوں کہنیاں چوکھٹ پر ٹکا لیتی اور ظاہر کرتی کہ وہ نیچے روڈ پر گزرتی ٹریفک دیکھ رہی ہے۔ کبھی انکھیوں سے اور کبھی پورے طور وضاحت سے وسیم کو دیکھتی اور کبھی کبھار تو وہ بے حد شوخی کا مظاہرہ کر کے وسیم کو ایک آدھ اشارہ بھی کر دیا کرتی تھی۔ وسیم اس دن بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ عشقیہ' رومانی گانے سنتا اور پہروں سوچ میں ڈوبا' مسکراتا رہتا۔ ماہرہ کچن کے روشن دان تک اسٹول کے ذریعے پہنچتی تھی اور وہاں سے شائلہ کی حرکات پر نگاہ رکھتی تھی۔ لیکن اس جاسوسی سے اسے کچھ خاص فائدہ حاصل نہ تھا کیونکہ وسیم اور شائلہ چھپ چھپا کر نہیں بلکہ علی الاعلان نظر بازی کا کھیل کھیلتے تھے۔

وسیم کو ماہرہ کا ڈر تو کیا' معمولی سی مروت بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ شائلہ کو دنیا والوں کی پرواہ نہ تھی یوں بھی وہ سال بھر شادی کا کھیل رچا کر معتبر بن چکی تھی۔ اب اسے ''کنواری'' اور ''جوان جہان'' لڑکی کے ٹائٹل سے نجات مل چکی تھی۔ وہ اپنے تئیں بہت ''ان ڈیپنڈنٹ'' خیال کرنے لگی تھی۔

ان کا یہ نظر بازی سے مزین عشق بہت نیا نہ تھا۔ یہ تب کی بات تھی جب وسیم روزگار سے بھی نہ لگا تھا۔ وہ سارا دن ٹیپ پر گانے لگائے کھڑکی میں بیٹھا رہتا تھا۔ شائلہ بیوہ ماں کی اکلوتی اولاد تھی۔ اسے بھی سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے' والا گانا متاثر کر گیا۔ ماں تو وہ کسی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ وہ پوری طرح سے چاند بننے پر آمادہ ہو کر

کھڑکی کے افق پر تنگی رہتی اس وقت وسیم کی ماں زندہ تھی۔ اس نے جو بیٹے کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ہرگز شائلہ جیسی خوبصورت بلا کو گھر لانے کا خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی جو کھلی کھڑکیوں سے پرائے لڑکوں سے تاکا جھانکی کرتی ہوں۔

ماہرہ کی ماں' وسیم کی ماں کی پرانی سہیلیوں میں سے تھی۔ وسیم کی ماں نے چند ایک مرتبہ ماہرہ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک ذہین' لائق اور اچھے اخلاق کی لڑکی تھی۔ ماہرہ کی ماں اپنی بیٹی کی کم روئی سے پریشان تھی۔ رشتے آتے تھے لیکن کہیں بات نہ بنتی تھی۔ اسے وسیم کی شکل و صورت بھا گئی۔ کم شکل بیٹی کے لئے خوبصورت' وجیہہ لڑکے کا رشتہ اسے اچھا لگا۔ لڑکے کی تعلیم کم بھی تھی تو اس سے فرق نہ پڑتا تھا۔ وسیم محض بی۔ اے پاس تھا۔ ماہرہ کی ماں نے کم تعلیم اور بے روزگاری کے باوجود اپنی ذہین' اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹی کا ہاتھ وسیم کے ہاتھ میں تھما دیا۔

وسیم کو شادی کی اولین رات ہی بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ اسے ماہرہ کی ڈگری سے دلچسپی نہ تھی بلکہ یہ بات تو اس کے لئے باعث ہتک تھی کہ بیوی اس سے زیادہ پڑھی لکھی اور قابل تھی۔ پھر وہ شائلہ کی گوری رنگت کا مارا ہوا تھا۔ اسے سانولے رنگ کی بیوی اپنے ارمانوں کا خون محسوس ہوئی۔ پہلی رات ہی دونوں کے مابین ایک ان دیکھی خلیج حائل ہو گئی۔

ماہرہ کو نئے نویلے دولہا کی عدم دلچسپی کی وجہ جلد ہی سمجھ آ گئی۔ وسیم سارا دن کھڑکی میں ٹنگا رہتا۔ شائلہ اپنے رنگ برنگ آنچل لہرایا کرتی۔ وسیم ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگتا' وہ جواباً انگوٹھا دکھاتی۔

پڑوس کی لڑکی عظمیٰ جب ماہرہ کی دوست بنی تب اسے پورے اور اصل قصے کا ٹھیک ٹھیک علم ہو گیا۔ اسے یہ سب کچھ جان کر بے حد افسوس ہوا تھا۔ اس کے خیال میں وسیم کی ماں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ بیٹا قابو میں رکھنے کے لئے اس نے ماہرہ کو قربانی کا بکرا بنایا تھا۔

وسیم کی ماں' ان کی شادی کے چند ماہ بعد ہی ہیپاٹائٹس کا شکار ہو کر چل بسی۔ ماہرہ مزید تنہا ہو گئی۔ وسیم کی بے التفاتی بدستور تھی۔ کھڑکی میں بیٹھے رہنا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ وہ چھوٹی موٹی' پارٹ ٹائم قسم کی نوکریاں کرتا اور فل ٹائم عشق لڑاتا اور عشق بھی انتہا درجے کا فضول اور بے حاصل بھلا دور سے نظر آتی ایک گوری چٹی لڑکی میں کسی کی توجہ آخر کب تک

مبذول رہ سکتی ہے۔ اور اسے تکتے رہنے سے کیا حاصل کیا جا سکتا ہے؟ ماہرہ کو سمجھ نہ آتا۔ لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ اس بے ضرر' فضول اور لاحاصل عشق سے اس کی اپنی زندگی ضرور متاثر ہو رہی تھی۔ وہ موم بتی کی مانند قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ پھر زندگی نے ایک خوشگوار کروٹ لی۔ شائلہ کی اچانک ہی شادی ہو گئی۔ سامنے والی کھڑکی ویران ہو گئی۔ کبھی کبھار شائلہ کی خرانٹ ماں وہاں سے جھانکتی دکھائی دیتی پھر اگلے ہی پل کھڑکی بند ہو جاتی تھی۔

وسیم کی نگاہوں کے سامنے سے سورج ہٹا تو اسے آس پاس جلتے چراغ دکھائی دیئے۔ وہ روشنی کا متوالا تھا۔ بہرطور چراغوں کی جانب ہی متوجہ ہو گیا۔ ماہرہ کی زندگی میں تو چپکے سے بہار آ گئی۔ میاں کی ذرا سی توجہ اور محبت پا کر وہ پرانے زخموں کو بالکل بھول بھال گئی۔ اس نے کبھی وسیم کو اس کے اس فضول عشق کی بابت یاد نہ دلایا۔ کبھی اسے طعنہ دینے یا چڑانے کی کوشش نہ کی۔ اسے بارہا محسوس ہوتا تھا کہ وسیم اس کے لیول کا انسان نہ تھا۔ ان دونوں کی ذہنی سطح میں بے حد فرق تھا۔ ماہرہ محض تقدیر اور محبت کے سہارے' اس فرق کو پاٹنے کی اپنی سی کوشش کرتی رہی۔ اس سے بہرطور اس قدر تو فرق پڑا تھا۔ کہ ان دونوں کے مابین اجنبیت کی دیوار کی اینٹیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں اور وہاں بننے والے خلاء سے انہیں ایک دوسرے کے خلوص کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ دونوں کھانا ساتھ کھانے لگے۔ آؤٹنگ پر جانے لگے۔ ایک دوسرے کے من پسند موضوعات پر بات کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ تو تھا کہ ہر طرح کی کوشش میں ماہرہ کا حصہ وسیم کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا تھا پھر بھی اپنی ماسٹرز کی ڈگری کے سہارے وہ ایک ایسے شخص کو اپنا عادی بنانے میں کامیاب ہونے لگی کی زندگی کی شاہراہ پر اس کے لئے ''ان واحد'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

اور ابھی وہ پوری طرح اپنے مقاصد میں کامیاب بھی نہ ہو پائی تھی کہ قابو میں آتا ہوا گھوڑا پھر رسیاں تڑوا کر بھاگنے کا قصد کرنے لگا۔ سامنے والا جھروکہ پھر آباد ہو گیا۔ وہی رنگین ماحول پھر غزل کہنے لگا اور وسیم نگاہوں میں محبت کے جام بھر بھر کر لنڈھانے لگا۔

ماہرہ کی سنورتی ہوئی دنیا پھر اجڑنے لگی۔ کبھی کبھار اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے گھر سے شائلہ کے گھر تک کا فاصلہ ایک سانس میں عبور کر لے اور اس سے اگلی سانس میں اسے بے نقط سنا ڈالے۔ اس کا وہ خوبصورت چمکتا چہرہ لہولہان کر ڈالے۔ اس کی آنکھیں

ذہانت کو مانجھتا تھا۔ اپنی قابلیت کا یقین خود اپنے آپ کو دلاتا تھا۔

وہ فیصلہ کر چکی تھی!

جس وقت وہ شمائلہ کے فلیٹ کی گھنٹی کا بٹن دبا رہی تھی اس کے ہاتھ نہ کانپے تھے۔ اس کا حلق خشک نہ ہوا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نہ تھیں۔

دروازہ شمائلہ نے کھولا اور ماہرہ کو سامنے دیکھ کر یک ثانیہ کو سہم گئی۔ پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔

''جی؟'' اس نے انداز میں اجنبیت سمو کر پوچھا تھا جیسے وہ اسے جانتی ہی نہ ہو۔

ماہرہ نے جی ہی جی میں اس کی ذہانت کی داد دی۔

''میں اندر آ سکتی ہوں؟'' وہ نرم روی سے بولی تھی۔

''آیئے!'' شمائلہ نے اسے راہ دی۔ لیکن وہ تذبذب کا شکار تھی۔

ماہرہ ایک جذبے کے ساتھ اندر داخل ہوئی' شمائلہ کھڑکی میں سے جیسی نظر آتی تھی اس کا گھر ویسا نہ تھا۔ وہ ایک بوسیدہ قسم کا فلیٹ تھا جس میں سالخوردہ فرنیچر اور بے مصرف اشیاء بے ترتیب انداز میں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں پڑے ہوئے پلنگ پر شمائلہ کی بوڑھی ماں لیٹی ہوئی کھانس رہی تھی۔ البتہ شمائلہ بے حد سک سک سے تیار تھی۔ گہرے جامنی رنگ کے لباس میں وہ چمک رہی تھی۔

''تشریف رکھیے!'' شمائلہ نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

ماہرہ نے بیٹھ کر محسوس کیا کہ صوفے کا فوم پرانا ہو چکا تھا اور اسپرنگ باہر کو نکلے ہوئے تھے۔

''کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑا اڑا سا تھا اور حرکات میں اضطراب پوشیدہ تھا۔

''میں سامنے والی بلڈنگ کے فلیٹ نمبر 16 میں رہتی ہوں......'' ماہرہ یوں بولی جیسے وہ واقعی شمائلہ کے پاس کسی ضروری کام سے آئی تھی۔

''جی جی......''

''مجھے...... کبھی کبھار...... کھڑکی سے...... آپ نظر آتی ہیں!'' وہ ٹھہر ٹھہر

کر بولی تھی۔

اب کی بار واقعی شمائلہ کا رنگ اڑ گیا۔

''تو پھر؟'' وہ بے ساختگی سے بول پڑی۔

''کل آپ نے ایک کالی قمیض پہنی ہوئی تھی جس پر بہت اچھی کشیدہ کاری تھی...... آپ مجھے ایک نظر وہ قمیض دکھا سکتی ہیں؟ دراصل میں اپنی قمیض پر ویسی ہی کشیدہ کاری کرنا چاہتی ہوں!''

''اوہ...... ضرور!'' شمائلہ مسکرا دی۔

ماہرہ نے محسوس کیا۔ اس کی جان میں جان آ گئی تھی۔

✿............✿............✿

''یہ کس کی قمیض ہے؟'' وسیم یوں اچھلا تھا جیسے اس کے نیچے کوئی بچھو ہو۔

''سامنے والی بلڈنگ میں ایک لڑکی رہتی ہے...... شمائلہ......'' ماہرہ متانت سے بولی ''میں اس سے عاریتاً مانگ کر لائی تھی ذرا واپس کر آئیں...... پلیز!''

''م...... میں...... میں؟ تم پاگل تو نہیں ہو...... میرا مطلب ہے...... میں کیوں جاؤں؟ تم خود واپس کر آؤ!''

''میرے پاؤں میں موچ ہے۔ میں اتنی سیڑھیاں چڑھ اتر نہیں سکتی۔ یہ آپ کو ہی واپس کر کے آنا ہو گی...... کیا آپ میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟''

''وسیم نے بادل نخواستہ قمیض تھام لی۔ اس کا چہرہ کئی رنگ بدل رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ برسوں بعد پہلی مرتبہ محبوبہ کا سامنا کرنے کے خیال سے وہ گھبرا رہا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ماہرہ نے یہی محسوس کیا۔ وسیم قمیض لے کر فلیٹ سے نکلا تو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔''

''ماہرہ شیخ...... فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن......''

اس کے کانوں میں برسوں پرانے الفاظ گونج رہے تھے۔

✿............✿............✿

جلتی ہوئی موم بتیوں کو وہ یک ٹک گھور رہی تھی۔ موم بتیوں کی لو کے پس منظر میں

نظر آتا شمائلہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ قدرے گھبرائی ہوئی' کچھ شرمائی ہوئی' کنفیوز سی لگتی تھی۔

وسیم کپڑے تبدیل کر کے کمرے سے باہر آیا تو اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان دونوں کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

ماہرہ نے مسکرا مسکرا کر دونوں کو دیکھا تھا۔ آج وسیم کی سالگرہ تھی۔ ماہرہ نے اسے سرپرائز دینے کا تہیہ کیا تھا۔ اس نے وسیم کو بتائے بغیر ہی شمائلہ کو شام کی چائے پر مدعو کر لیا تھا۔ پھر اس نے چائے کے ساتھ کتنے ہی لوازمات کا بندوبست بھی کیا تھا۔ بجٹ ایک مرتبہ پھر اپ سیٹ ہونے لگا تھا۔ لیکن اس نے پروا نہ کی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو اپ سیٹ ہونے سے بچانا چاہتی تھی۔

وسیم اور شمائلہ کا یوں موم بتیوں کی روشنی میں آمنا سامنا خاصا سحر انگیز تھا۔ شمائلہ زرد لباس میں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ ماہرہ کو پورا پورا احساس تھا کہ وسیم بار بار نظر بچا کر اسے دیکھتا تھا۔ وہ دونوں جھینپے جھینپے سے لیکن خوش دکھائی دیتے تھے۔

ماہرہ نے اصرار کر کے وسیم سے کیک کٹوایا اور اسے اس کا تحفہ دیا جو کہ ایک رسٹ واچ تھی۔ وہ اسے گزرتے ہوئے وقت کے رائگاں جانے کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ نجانے وسیم اس کا اشارہ سمجھ بھی پایا تھا یا نہیں۔ شمائلہ اس کے لئے شرٹ پیس لائی تھی۔ وسیم شمائلہ کا تحفہ پا کر بے حد خوش ہوا تھا!

❁ .... ❁ .... ❁

پورا ایک سال اس نے جیسے تپتے ہوئے انگاروں پر چل کر گزارا تھا۔ اس کی روح زخمی ہونے لگی تھی۔ دل سے مدھم مدھم سی آنچ ہر لحہ آتی تھی!

اسے کئی بار خیال آیا تھا' شاید اس نے بہت بڑی حماقت کی لیکن ہر مرتبہ وہ سر جھٹک کر اپنے خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی تھی۔

وہ جوگن بن کر ایک ناگن کے زہر کا کاٹ کرنے کا چلہ کھینچ رہی تھی۔ اسے اپنے علم اور اپنی ریاضت پر بھروسہ تھا۔

بال بکھرائے' دھونی رمائے وہ محبت کا منتر پڑھ رہی تھی............ اس طرح کہ نہ تو خنجر کو پتہ چلے نہ بسمل کو............ دوسری طرف ناگن اپنی سحر انگیز آنکھوں میں پر اسرار چمک لئے اپنے شکار کو مسمرائز کر رہی تھی۔ نجانے کس وقت وہ پھیلا ہوا پھن لے کر شکار پر جھپٹ

پڑتی' کچھ اندازہ نہ تھا۔

ناگن چوکس تھی اور جوگن مطمئن!

❁ .... ❁ .... ❁

وسیم نے بٹوے میں سے رقم نکال کر گنی پھر جھنجھلا کر بٹوہ میز پر پھینک دیا۔

''کیا مصیبت ہے!'' وہ جھنجھلا اٹھا۔

ماہرہ نے کنکھیوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی' ان دونوں کے بیچ محبت کا کلائمکس چل رہا تھا۔ شمائلہ کی نت نئی فرمائشیں وسیم کے لئے عذاب جاں بنتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک کنگلے عاشق کی دوسری بیوی بننے پر خود کو آمادہ نہ کر سکی تھی اور اب کسی بھی طرح اس عشق فضول کا ڈھول اپنی گردن سے اتار پھینکنا چاہتی تھی۔ سو اب وہ ہر دوسرے دن وسیم سے کوئی مہنگی سی فرمائش کیا کرتی تھی۔ وسیم کھڑکی تک گیا۔ دوسری جانب کھڑی شمائلہ نے اس سے اشارے میں کچھ پوچھا تھا۔ وسیم نے قدرے غصے سے سر نفی میں ہلایا۔ دوسری جانب کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی گئی۔ وسیم نے اپنی کھڑکی اس سے بھی زیادہ زوردار آواز میں بند کی اور زیر لب ایک موٹی سی گالی بھی دی۔

ماہرہ نے پرسکون سانس لیا۔ وہ جانتی تھی' اب یہ کھڑکیاں کبھی نہ کھلنے کے لئے بند ہوئی تھیں۔ جوگن نے زہر نکال کر اسے تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ ریاضتوں کا سفر کامیابی سے طے ہوا تھا۔ وسیم کی جولانی طبع کو کسی نئے عشق پر آمادہ ہونے کے لئے اب ایک طویل عرصے کی ضرورت تھی۔

دونوں کھڑکیوں کے مابین کچھ نہ تھا' سوائے **Fantacy** کے اور **Fantacy** ختم ہو جائے تو دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

ماہرہ ایک عزم کے ساتھ تھکے ہارے' مضمحل' شکست خوردہ اور شرمندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے وسیم کے لئے چائے بنانے کے لئے اٹھی۔

''ماہرہ شیخ...... فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن...... ماسٹر ان اپلائیڈ سائیکلوجی............'' اس کے کانوں میں الفاظ گونجے۔ اس کے ذہن میں اپنی ڈگری کا عکس چمک رہا تھا!

❁ .... ❁ .... ❁

پر کٹی

اطہر نے چپکے سے نگاہیں اٹھائیں اور کتاب کے پیچھے چہرہ چھپا کر اسے دیکھا۔ وہاں موسلادھار برسات ہو رہی تھی۔ موسم بے حد خطرناک ہو چکا تھا۔ اطہر نے جلدی سے کتاب اوپر کر لی اور ناول پڑھنے میں بری طرح منہمک ہو گیا۔

ماریہ اب سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ چیزوں کی اٹھا پٹخ جاری تھی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی نجانے کیا کر رہی تھی۔ اطہر کو الجھن ہونے لگی۔ اس نے پھر ذرا کی ذرا کتاب سرکا کر اسے دیکھا۔ وہ ٹشو پیپر سے آنکھوں کو خوب خوب رگڑ رہی تھی۔ پھر وہ ہیئر برش اٹھا کر بالوں میں چلانے لگی۔ انداز میں کسی بپھرے ہوئے دریا کا سا زور و شور تھا۔ اطہر پھر کتاب کے پیچھے دبک گیا۔

چند ثانیوں کے بعد وہ دھڑام سے اپنی جگہ آ کر گری۔ تکیہ سر کے نیچے سے نکال کر چہرے پر رکھا اور بے حس و حرکت ہو گئی۔

اطہر کا جی چاہا' کتاب بند کر کے دور پھینکے اور اس کا تکیہ اٹھا کر کتاب پرے مارے پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اپنا قصور پوچھے! بھلا اس سارے قصے میں اس کی جانِ ناتواں کا کیا قصور تھا؟

آج کا دن جو کہ گزر ہی چکا تھا' ان کی شادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ ماریہ چونکہ بے حد رومینٹک مزاج کی حامل لڑکی تھی سو اپنے مزاج کی مناسبت سے اس نے اپنی شادی کی سالگرہ کے لئے خوب خوب پروگرام ترتیب دیئے تھے۔ آخر یہ ان کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی وہ اس دن اپنے عروسی جوڑے میں ملبوس ہو کر سالگرہ کا کیک کاٹنا چاہتی تھی۔ پھر وہ آؤٹنگ کے لئے باہر جانا چاہتی تھی۔ ''کوپر کیٹل'' میں ایک عالی شان قسم کے ڈنر کے بعد

اس کا ارادہ ساحل سمندر پر جانے کا تھا۔ سوئے اتفاق آج کی رات چاندنی رات بھی تھی ماریہ بہت جوش و خروش کے ساتھ کوئی ہفتہ بھر سے یہ سب پروگرام ترتیب دے رہی تھی۔ اطہر نے بڑے پیمانے پر دعوت ارینج کرنا چاہی تو ماریہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ دن قطعی طور پر صرف ان دونوں کا دن تھا اور کسی تیسرے فرد کی مداخلت اسے منظور نہ تھی۔ کجا یہ کہ دعوت کے نام پر کئی لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا۔ اطہر نے بھی اس کی خوشی کے خیال سے اپنے آئیڈیا کینسل کر دیا تھا۔ آفس سے بھی وہ بہت جلد لوٹ آیا تھا۔ لیکن آج کا دن شاید قسمت کی خرابی کا دن تھا۔ گھر لوٹ کر اسے علم ہوا کہ اس کی دونوں بہنیں اپنے اپنے کنبے کے ہمراہ گھر میں موجود تھیں۔ عارفہ اور شارقہ کی یادداشت بلا کی تیز تھی اور ایسے مواقع وہ خاص طور پر ذہن نشین کر لیا کرتی تھیں۔ وہ دونوں بنا کسی تحفے کے' اپنے اپنے بچے لے کر آ گئی تھیں اور اپنی ماں سے خاص طور پر گھر کی پکی ہوئی بریانی اور کھیر کی فرمائش کی تھی۔ صباحت بیگم نے بیٹیوں کی فرمائش پر فی الفور ماریہ کو بریانی اور کھیر تیار کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔

اطہر جس وقت گھر لوٹا' ماریہ اسے عروسی لباس میں ملبوس ملنے کے بجائے ایپرن باندھے پیاز کاٹتی ہوئی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں سے دھواں دھار پانی بہہ رہا تھا۔ جو پیاز کے اثرات کے بجائے اس کے اندرونی جذبات کا مظہر تھا۔ اطہر نے اس سے بات کرنی چاہی تو وہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر اس کی بہنیں 'بھائی' بھائی' اور بچے' 'ماموں' ماموں' کرتے کمرے میں آن گھسے تو اس کا دھیان ماریہ کی جانب سے ہٹ سا گیا۔ وہ بہنوں کی خوش گپیوں اور بھانجے بھانجیوں کی شرارتوں میں محو ہو گیا۔

رات گئے اس کے بہنوئی اپنی اپنی بیویوں کو لینے آئے۔ ماریہ کو پھر سے کھانا گرم کر کے انہیں بھی سرو کرنا پڑا بظاہر وہ خاموش اور پرسکون تھی لیکن اطہر جانتا تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے کتنے طوفان پوشیدہ ہیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد جب گھر میں سناٹا چھا گیا اور امی ابو سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کمرے میں اٹھا پٹخ کرنے لگی تھی اور اب تھک ہار کر سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ اطہر کا جی چاہتا تھا

وہ اسے منائے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ایک مرتبہ رونا شروع کر دے گی تو ساری رات اس کے آنسو پونچھتے ہی گزرے گی۔ پھر یہ مسئلہ کوئی نیا تو نہ تھا اور نہ ہی حل ہو سکتا تھا۔ وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا! پھر اس کی بہنیں عمر میں اس سے کافی بڑی تھیں۔ کسی بھی معاملے میں ماں، بہنوں کے سامنے جرأت لب کشائی اسے نہ تھی۔ عارفہ اور شارقہ اپنے اپنے گھروں میں قطعاً آزاد اور خود مختار تھیں۔ شوہر ان سے دبتے تھے۔ ان پر قدغن لگانے یا روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ دونوں ہر دوسرے روز اپنے بچے لے کر میکے میں آن دھمکتی تھیں۔ ماں باپ اپنی بیٹیوں کے دیوانے تھے۔ وہ ان پر واری نثار ہوئے۔ ان کے بچوں کے آگے پیچھے پھرتے۔ ماریہ کو ان کی خاطر مدارت میں اپنا پورا دن کچن کی نظر کرنا پڑتا تھا۔

شروع شروع میں اسے بھی مزہ آیا۔ نندوں کے آجانے سے گھر میں رونق ہو جایا کرتی تھی۔ ان کے بچوں کی معصومانہ باتوں میں بے حد اچھا وقت گزرتا تھا۔ اطہر اور وہ خوب خوب سنا کرتے تھے۔ اکثر پکنک کا پروگرام بنا کرتا۔ سب مل کر پکنک پر جاتے۔ خوب ہلا گلا ہوتا۔ کبھی گھر پر ہی محفل جمتی۔ باہر سے کھانا منگوا لیا جاتا۔ وہ سب مل کر تاش کھیلتے۔ کوئی نئی فلم دیکھی جاتی۔ تبصرے ہوتے۔

رفتہ رفتہ ماریہ کا جی ان باتوں سے اوبنے لگا۔ اس پر انکشاف کے در وا ہونے لگے۔ اطہر ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز تھا اور پرکشش تنخواہ پاتا تھا۔ لیکن بہنوں کے ہر دوسرے روز وارد ہونے اور دعوتیں اڑانے کے عمل سے تنخواہ میں سے کچھ بھی پس انداز نہ ہو پاتا۔ مہینے کے ختم ہونے سے پہلے ہی تنخواہ ختم ہو جاتی۔ اطہر کو ادھار لینے کی نوبت بھی اکثر آجایا کرتی۔ پھر ماریہ کی مصروفیت بے پناہ رہتی۔ طرح طرح کے پکوان بنا کر وہ عاجز ہو جاتی تھی۔ پھر بھی بچے نت نئی فرمائشیں کیا کرتے۔ عارفہ اور شارقہ "مامی سے کہو" کا لاڈ بھرا جملہ بول کر بے فکری سے ماں سے باتوں میں مشغول رہتیں۔ ماریہ کے ارد گرد بچے ناچا کرتے اور شور مچا مچا کر مختلف فرمائشیں کرتے۔ ان کے جانے کے بعد بھی ان کی بکھیری ہوئی چیزیں سمیٹتے سمیٹتے اسے آدھی رات ہو جاتی تھی۔ تب کہیں تھک ہار کر اسے بستر نصیب ہوتا تھا۔ چند ایک دن سکون رہتا اور پھر ایکشن ری پلے ہو جاتا تھا۔ ماریہ آرٹسٹک مزاج کی لڑکی تھی۔ اسے گھر کو سجانے سنوارنے کا شوق تھا۔ جگہ جگہ رکھے ہوئے ڈیکوریشن پیس اسے

بھاتے تھے۔ لیکن عارفہ کے پانچ اور شارقہ کے تین بچوں نے اس کے شوق کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ ماریہ کی شوق سے بنائی ہوئی چیزیں کچھ ہی عرصے میں کوڑے دان کی زینت بن جایا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس نے اس شوق سے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ گھر کی دیواروں پر بچوں نے خوب خوب گل و گلزار کھلائے تھے۔ ان لوگوں کا بیڈ روم بھی اس کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ ماریہ کے جہیز میں آئے ہوئے فرنیچر کی خوب ریڑھ لگی تھی۔ سائیڈ ٹیبلوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ درازوں کے لٹو نکل گئے تھے۔ صوفوں کا کپڑا کسی ستم ظریف نے چھری مار کر پھاڑ دیا تھا۔ ماریہ بے حد حسرت سے اپنے جہیز کی بیش قیمت چیزوں کا حشر دیکھا کرتی تھی۔

اطہر جانتا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ لیکن وہ خود کو مجبور محض پاتا تھا۔ آخر وہ اپنی بڑی بہنوں کو گھر آنے سے روک تو نہ سکتا تھا۔ ان کے بچوں کے ہاتھ پیر وہ نہیں باندھ سکتا تھا نہ ہی انہیں تمیز سکھانا اس کے اختیار میں تھا۔ ماں باپ کے سامنے زبان کھولنے کا بھی وہ تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ کجا یہ کہ وہ ان سے الگ ہونے کے متعلق سوچتا!

پس اتنا طے تھا کہ اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا جو وہ ماریہ کے لئے کر پاتا۔ بھلا وہ اس کے حق میں بولتا بھی تو کیا بولتا؟ ماریہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ ازدواجی زندگی میں نندوں کی بے جا مداخلت نے اس کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ وہ خوشی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے طور پر جینے کی خواہش مند تھی۔ اسے پرسکون گھر کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن عارفہ اور شارقہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اپنی روش سے دستبردار ہونے پر قطعاً آمادہ نہ تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ گھر کی ہر ہر چیز میں ان کا حصہ ہے اور وہ دھڑلے سے اپنا حق وصول کرتی تھیں۔ غالباً انہوں نے اپنا حق ماریہ کی خوشیوں میں بھی شامل کر لیا تھا۔

❁ ……… ❁ ……… ❁

ماریہ کے مزاج میں تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ دن بدن ذہنی طور پر اطہر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ یوں تو وہ ایک نرم مزاج اور اچھے دل کی لڑکی تھی لیکن حالات اسے بدمزاج بننے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اطہر کو اپنی پرواہ نہ تھی لیکن اسے اپنی بہنوں اور اپنے ماں باپ کے جذبات کا خیال تھا اسے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں ماریہ ان لوگوں سے برے طریقے سے پیش نہ آئے۔ وہ ماریہ کو سمجھانا چاہتا تو اس کا ردعمل بے حد خراب ہوتا تھا۔

وہ اسے برا بھلا کہتی۔ دو دو دن بات نہ کرتی۔ منہ پھلائے پھرا کرتی۔ ہر چند کہ اب تک اس نے اپنے ساس سسر یا نندوں سے براہ راست ایسی کوئی بات نہ کی تھی لیکن اس کا گریز آمیز رویہ بزبان خود اپنی کہانی کہنے لگا تھا۔ اطہر کی ماں کی پیشانی شکن آلود رہنے لگی تھی۔ انہیں بیٹیوں سے بے حد محبت تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ ہر مرتبہ ان کی آمد پر انہیں شایانِ شان پروٹوکول پیش کیا جائے۔ اطہر مشکل میں تھا۔ وہ نہ اپنے گھر والوں سے کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ماریہ سے روز روز کی معذرتیں اسے مناسب لگتی تھیں۔ وہ نہ گھر والوں کو قصور وار سمجھتا تھا اور ماں بہنوں کی محبت سے بھی بندھا ہوا تھا۔ بس اسے توازن قائم کرنے میں دشواری کا سامنا تھا۔ ماریہ کی جانب سے طبلِ جنگ روز روز مزید پر دھمک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک پر عزم کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ ایک خاص اور منطقی نتیجے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اطہر اس کی خاموش پیش قدمی محسوس کر کے خوفزدہ ہو گیا۔ وہ اپنا گھر برباد ہونے سے بچانا چاہتا تھا!

❁ .... ❁ .... ❁

ماریہ نہانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ واڈروب کے سامنے کھڑی نظروں ہی نظروں میں لباس کا انتخاب کر رہی تھی۔ اطہر خاموشی سے اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر لال رنگ کا لباس کھینچ کر نکالا۔

''یہ پہنو!'' اس نے نگاہوں میں محبت کے سات رنگ بھر کر اسے دیکھا ''سرخ رنگ، محبت کی علامت!'' ماریہ کی خفا رہنے والی نگاہوں میں حیرت اُمڈی۔ اطہر جیسا لئے دیئے رہنے والا انسان اسے محبت کی علامت کا رنگ پہننے کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ اور محبت؟ ان دونوں کے بیچ بھلا محبت تھی کہاں؟ ''نہیں......'' وہ آہستگی سے بولی ''یہ پہننے کو جی نہیں کرتا۔ گرمی بہت ہے۔ کوئی لائٹ سا کلر......''

''اوں ہوں......'' اطہر نے مان سے اسے لباس تھمایا ''لال رنگ میں تم بے حد دلکش نظر آتی ہو۔ تمہیں یہی پہننا ہوگا۔ میری خاطر!''

ماریہ جز بز ہوئی۔ پھر خاموشی سے کپڑے لے کر واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ اطہر کے لبوں کے گوشے مسکرانے لگے۔ ہر ہر بات میں کج بحثی کی عادی ماریہ نے بے حد آرام سے اس کا کہا مان لیا تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

''اس قدر لاجواب چائے بس تم ہی بنا سکتی ہو!'' اطہر نے پیالی تھامنے کے بجائے ماریہ کا ہاتھ ہی تھام لیا تھا۔ ماریہ جھینپ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''پی کر تو دیکھیں پہلے!'' وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

''پی کر کہا تو کیا کہا!'' اطہر مسکرایا ''اس چائے کی پیالی میں جو محبت ہے اس کا نشہ بنا پیے ہی محسوس کیا جا سکتا ہے......''

اس نے محبت سے اس کے چہرے پر جھولتی لٹ اس کے کان کے پیچھے کی۔ ماریہ کا چہرہ اندرونی خوشی کے احساس سے سرخ ہو رہا تھا۔

''اطہر...... آپ...... ایسے کیوں نہیں تھے پہلے......'' اس نے ماتھا اس کے کاندھے سے ٹکا کر کہا۔

''میں تو ایسا ہی ہوں ماریہ...... تم نے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' وہ محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ ''مجھے تمہاری بے مہر نگاہوں سے شکایت ہے انہیں میری نظروں کی زبان سمجھ نہیں آتی۔''

ماریہ نے چہرہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''صرف نظروں میں کام نہیں چلے گا......'' وہ مسکرائی ''زبان بھی استعمال کرنا ہو گی۔ آپ کے لبوں سے ایسی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں......''

''جو حکم سرکار کا......'' وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

ماریہ مسکرا دی تھی!

❁ .... ❁ .... ❁

''ماریہ جان، کل شارقہ باجی آ رہی ہیں...... ان کے بچوں کی اسکول کی چھٹیاں ہیں۔ وہ ہفتہ بھر ہمارے ساتھ رہیں گی۔''

ماریہ کا چہرہ لمحہ بھر کے لئے بجھ سا گیا۔ اطہر نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''وہ جو میٹھا تم نے اس روز بنایا تھا...... کس قدر لاجواب تھا...... میں تو انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔ وہی بناؤ نا کل...... سچ عید کا مزہ آ جائے گا!''

''اچھا'' ماریہ مسکرائی ''آپ کو پسند آیا!''

''ارے زبردست! تمہارے ہاتھ میں جو ذائقہ ہے ایسا ذائقہ تو امی جان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کہتے ہیں بیٹے اپنی ماں کے ہاتھ کا پکا نہیں بھولتے۔ تم نے تو مجھے سب کچھ بھلا کر اپنا اسیر کر لیا ہے۔''

ماریہ کا چہرہ گل و گلزار ہو گیا۔

''پھر کل کیا کیا کھلا رہی ہو؟'' اطہر نے لاڈ سے پوچھا۔

''جو آپ کہیں.........'' وہ مسکرائی۔

''یعنی جناب کا مینو ہمیں ترتیب دینا ہو گا؟ بھئی واہ......... تند آپ کی آئے......... ذہن پر زور ہم ڈالیں......... کہاں کا انصاف ہے......... خیر خیر میں سوچ کرتا تا ہوں۔ تب تک ایک پیالی چائے ہو جائے؟''

''ابھی لائی.........'' ماریہ لچکتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔

اطہر نے سکون کا سانس لیا۔ اس کی نگاہ اپنی انگلیوں پر گئی۔ ان کے درمیان ماریہ کا لانبا' سنہرا بال پھنسا ہوا تھا۔ اطہر نے ہاتھ اپنے چہرے کے قریب کر کے اس بال کو غور سے دیکھا پھر وہ مسکرا دیا۔!

تم بھی تو یہی کرتے

میں نے شدت سے دکھتے ہوئے پپوٹوں کو ملا اور بمشکل آنکھیں کھول کر اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی اس نازنین کو دیکھا۔

اس نے آسمانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے آسمانی رنگ کا باریک دوپٹا اس کے سیاہ بالوں کے لشکارے چھپانے سے قاصر تھا۔ ایک لانبی' شریری لٹ اس کے گال سے بار بار ٹکرا رہی تھی۔ جسے وہ شہادت کی انگلی سے کان کے پیچھے کرتی اور لٹ پھر مسکرا کر سر نکال لیتی تھی۔ لٹ کی شرارت بھری مسکان سے قطع نظر اس کا اپنا چہرا قطعاً سنجیدہ تھا اور لب ہلکی سی سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ پھر میں نے سامنے میز پر پڑے ہوئے اس کاغذ کو دیکھا یہ علی کا خط تھا۔ سفارش نامہ' جو وہ نازنین اپنے پرس میں' اس امید پر رکھ کر لائی تھی کہ میں اسے پڑھتے ہی اسے نوکری دے دوں گا۔ اس کی امید کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ علی میرا بہترین دوست تھا۔ ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اور میں اس کی سفارش ہرگز رد نہ کر سکتا تھا۔ اول تو وہ بے جا سفارش کا قائل نہ تھا' دوسرے وہ انتہائی مجبوری کی حالت میں کوئی ایسا قدم اٹھاتا تھا۔

خط کے الفاظ پر سے میری نظریں پھسلتی ہوئی اس کی آپس میں الجھی ہوئی انگلیوں میں جا ٹکیں۔ میز پر دھرے ان ہاتھوں میں ایک عجب ارتعاش سا تھا۔ شاید وہ نروس ہو رہی تھی۔ جب کوئی میرے سامنے بیٹھ کر نروس ہونے لگے تو مجھے لطف محسوس ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ایک زمانے میں میں بھی بڑا نروس شخص تھا۔ جب میں کسی نوکری کے لئے ہونے والے انٹرویو کے لئے کسی بورڈ کے ممبران کے سامنے جا کر بیٹھتا تو میرا ماتھا نم ہو جایا کرتا تھا اور کانپتی انگلیوں کو آپس میں سختی سے الجھا کر میں ہمیشہ اپنی گود میں رکھ لیا کرتا تھا اور

سب سے پہلے ایک گلاس پانی مانگا کرتا تھا۔

''سر ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟'' میرے کانوں سے اس کی آواز ٹکرائی۔

میں نے اس کے روشن چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور گھنٹی بجا کر چپڑاسی سے پانی لانے کے لئے کہا۔

''کیا نام بتا آپ نے؟'' میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

ہر چند کہ اس کی فائل میرے سامنے پڑی تھی۔ جس پر موٹے موٹے حروف میں ربیعہ انصاری لکھا تھا۔ اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ مجھے دو مرتبہ اپنا نام بتا چکی تھی۔ جو مجھے یاد بھی تھا۔

''جی ...... ربیعہ ...... ربیعہ انصاری۔''

اس نے پانی کا گلاس جلدی سے لبوں سے ہٹا کر جواب دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سا پانی اس کے کپڑوں پر چھلک گیا۔ گلاس میز پر رکھ کر وہ شرمندگی سے اپنے کپڑے جھاڑنے لگی۔ ٹشو پیپر کا ڈبہ میں نے خاموشی سے آگے کر دیا۔

اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ بڑی شرمیلی طبیعت رکھتی ہے اور ناک کی بناوٹ سے اس کے انتہائی خود دار اور کم آمیز ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ ہونٹوں کے کٹاؤ سے علم ہوتا تھا کہ وہ اتنی کم گو نہیں ہے' لیکن محتاط ہے۔

اس کی فائل سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے اندر خاصی قابلیت رکھتی ہے اور کوئی گئی گزری لڑکی نہیں' لہٰذا اس کی گھبراہٹ کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ایک عدد سفارشی خط لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اور اس بات پر مجھ سے اور خود سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

''مس ربیعہ انصاری'' میں نے خط اپنی دراز میں ڈال لیا۔'' آپ کل سے آ سکتی ہیں۔ میں آپ کو اپائنٹمنٹ لیٹر ٹائپ کروائے دیتا ہوں۔ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ آپ کو آتی ہے۔ ڈکٹیشن بھی آپ اچھی ہی کر لیں گی۔ آپ کا تعلیمی ریکارڈ اچھا ہے۔ آپ کی میز یہیں میرے کمرے میں ہو گی۔''

''اوہ!'' نجانے کب کا مقید سانس اس کے سینے سے برآمد ہوا تھا۔

میں نے لب کو دانتوں سے دبا کر مسکراہٹ کو روکا اور متین بنے رہنے کی کوشش

جاری رکھی۔

''فی الحال آپ کی تنخواہ چھ ہزار روپے ماہوار ہے بعد میں اس میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور ہوتا رہے گا۔''

''تھینک یو سر! تھینک یو ویری مچ۔'' اس کی آنکھیں سچ مچ بھر آ گئیں۔

''کانچ کی گڑیا'' میرے ذہن نے فوراً اس منظر پر کیپشن لگایا۔

نجانے کیا بات ہے' ہر منظر' ہر سچویشن پر میرا ذہن کوئی نہ کوئی عنوان ضرور فٹ کرتا ہے اس کے بعد میں نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں بند لیں۔ جلتی ہوئی آنکھیں بند کرنے سے کیسی رقت آمیز تکلیف ہوتی ہے۔ گزشتہ رات جاگتے ہوئے میری آنکھیں اب لال بھبھوکا ہوتی تھیں۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

''میں تم سے بیزار ہو چکا ہوں۔ تمہاری صورت سے نفرت ہو چکی ہے مجھے۔ تم پر نگاہ پڑتے ہی میرا اچھا بھلا موڈ بھی غارت ہو جاتا ہے۔ آئی ہیٹ یو' آئی ہیٹ یو۔''

یہ میرے آخری الفاظ تھے جو میں نے رات کو عنبرین سے کہے تھے۔ اس کے بعد وہ ڈائننگ روم میں جا کر الماری سے کانچ کے برتن نکال نکال کر توڑنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد ذہن کو فریش کرنے کے لئے یہ اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ تین چار ڈنر سیٹ' دو تین ٹی سیٹ وغیرہ توڑ کر اس روحانی مشق کا اختتام ہوتا تھا۔ اور پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے سو جاتی تھی۔ اور میرے دماغ میں بقیہ ساری رات برتنوں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔

چھن' چھن' چھناک' چھناک۔''

میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔

نغمانہ میرے مقابل کھڑی تھی۔ نجانے اسے کیسے علم ہو جاتا تھا کہ میں عنبرین سے کب لڑتا ہوں۔ دوسرے دن میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔

''بس نغمانہ۔ پلیز ......''

دو کپ چائے بنا کر لے آئی اور اپنا کپ لے کر میرے مقابل بیٹھ گئی۔

اس کی مخصوص عادت تھی۔ میں جب بھی چائے پیا کرتا وہ دو کپ چائے بناتی اور

اپنا کپ لے کر سامنے بیٹھ کر پیا کرتی تھی۔ اپنی ملازمت کے دن سے اس لڑکی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن عنبرین میری زندگی میں آنے والی پہلی اور اب تک آخری لڑکی تھی۔ دراصل میری زندگی میں آنے کے بعد اس نے مجھے لفظ ''عورت'' سے چڑ دلا دی تھی کہ دوسری کسی عورت کے آنے کا کوئی راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ اور پر لطف بات یہ تھی کہ میری اور اس کی ہر لڑائی کی بنیادی وجہ اس کا وہ شک تھا' جو وہ مجھ پر کسی دوسری عورت کے مجھ سے دس فٹ کے فاصلے سے گزر جانے پر بھی کیا کرتی تھی۔ اس کے اس شک نے میری زندگی کانٹوں کی سیج بنا دی تھی۔ مجھے زندگی اور عورت دونوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ ایسے میں بھلا کسی نعمانہ یا نعمانہ کی کیا چلنی تھی؟

عنبرین سے میری شادی کسی افیئر کا نتیجہ نہ تھی۔ مجھ سے پہلے یہ بزنس اس کے والد سنبھالا کرتے تھے اور میں...... اس آفس میں ایک معمولی کلرک کے طور پر بھرتی ہوا تھا۔ بعد ازاں میری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے ترقی پر ترقی دیتے گئے۔ اور پھر ایک دن ان نوازشات کا پول بھی کھل گیا۔ جب انہوں نے مجھے اپنا سارا بزنس سنبھال لینے کی آفر کی لیکن اس شرط پر کہ میں ان کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر لوں۔

میں نہیں جانتا' عنبرین میں کیا کمی یا کون سی خامی تھی' جو انہیں از خود اپنی بیٹی کے لئے کسی شخص سے کہنا پڑا۔ وہ قبول صورت پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ البتہ مزاج کی از حد تیز تھی۔ بعد میں اس کے مزاج کی یہ تیزی اور تلخی میری پوری زندگی میں گھل گئی۔

وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے شادی کر کے اس نے مجھ پر احسان عظیم کیا ہے۔ اتنا بڑا بزنس محض اس کی وجہ سے مل گیا ورنہ میں تو ساری عمر فٹ پاتھوں پر جوتیاں چٹخاتا رہتا۔ اسے وہم رہتا تھا کہ میں دوسری عورتوں سے جان بوجھ کر فری ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ دعوتوں میں وہ مجھے بار بار ٹہوکے دے کر اپنی جانب متوجہ کئے رہتی اور واپسی میں پوچھتی۔

''یہ تم بلا وجہ مسز عثمانی کے گلے کا ہار کیوں بنے جا رہے تھے؟ کیا میں دیکھ نہیں سکتی کہ تمہاری نگاہیں کہاں ہوتی ہیں؟ تم عالیہ احمد کی بلائیں نگاہوں ہی نگاہوں میں لے رہے تھے۔ بس چلتا تو اسے اپنے ساتھ اٹھا لاتے۔ تم ہر کسی سے اس قدر جھک کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی ...

جاتے نا ں اس کی۔''

''یا خدا!'' میں اپنا سر تھام لیتا۔ آخر میں بھی انسان تھا۔ مرد تھا۔ جوان تھا۔ بھولے بھٹکے' دانستہ یا نادانستہ نگاہ کسی سمت اٹھ ہی جاتی تھی۔ نگاہوں کے پر تو نہیں ہوتے جنہیں میں کاٹ ڈالتا۔ پیر بھی نہیں ہوتے جنہیں زنجیریں ڈال دیتا۔

وہ مجھے جتنا احساس دلاتی اتنا ہی میری نظریں دوسری جانب اٹھا کرتیں۔ اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے محفلوں' دعوتوں میں جانا انتہائی کم کر دیا۔ وہ مجھ سے کہیں چلنے کا کہتی' میں صاف انکار کر دیتا۔ وہ شاپنگ کے لئے ضد کرتی میں جان بوجھ کر دیر سے گھر جاتا۔ وہ فلم پر چلنے کے لئے اصرار کرتی میں اسے مشورہ دیتا' اپنی کسی سہیلی کے ساتھ چلی جاؤ' اسکرین پر ہیروئن آئے گی' خوامخواہ میری آنکھیں سینکیں گی۔

ہمارے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی۔ زندگی کی رسی کو تھام کر چلنے کے بجائے ہم دونوں دو انتہائی سروں پر چلے گئے اور روز مرہ کی لڑائیاں ہمارا معمول بن گئیں۔ اس تپتے ریگزار میں ننگے پاؤں چلتے ہوئے بارش کا جو پہلا قطرہ میرے لبوں سے ٹکرایا' اس کا نام ربیعہ انصاری تھا۔

✿ .... ✿ .... ✿

آسمانی رنگ میرا فیورٹ تھا۔ شاید اس کا بھی تھا۔ وہ عموماً آسمانی رنگ کا لباس زیب تن کرتی تھی۔ اس رنگ میں اس کی رنگت چمکنے لگتی تھی اور اس کی بادامی آنکھوں میں نیلے سمندروں کا عکس آ جاتا تھا۔ آسمانی دوپٹے کے نیچے سے اس کے بال اپنے گہرے سیاہ ہونے کا بھرپور احساس دلاتے تھے اور اس کی آنکھوں میں کاجل کی جوت نمایاں ہو جاتی تھی۔ ناک کی لونگ مزید لشکارے مارتی تھی اور لبوں کی گلابیاں واضح ہو جاتی تھیں۔ لیکن شاید یہ سب کچھ میرا وہم تھا۔ وہ تو مجھے ہر رنگ میں اچھی لگتی تھی۔

اس دن وہ نو بجے تک نہیں آئی۔ میں ٹھیک پونے نو بجے آفس پہنچ جاتا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ کون کتنا وقت کا پابند ہے۔

ربیعہ انصاری مجھے ہمیشہ اپنی سیٹ پر ملتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ احتراماً کھڑی ہوتی اور دھیما مسکراتی تھی۔

لیکن آج وہ اپنی سیٹ پر موجود نہ تھی۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

کیا آج وہ نہیں آئے گی؟ اس نے چھٹی کر لی ہے؟ لیکن اس کا فرض تھا کہ مجھے پہلے سے مطلع کرتی؟

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر نغمانہ کی سیٹ کی ہوئی فائلیں اپنے آگے کھسکائیں اور رسٹ واچ پر گناہ دوڑائی۔ اس کے نہ آنے کے تصور سے میں نجانے کیوں پریشان ہو رہا تھا۔ شاید وہ میرے لیے سکون آور دوائی کی شیشی تھی جسے محض اپنے سامنے رکھا دیکھ کر مطمئن رہتا تھا۔ عنبرین کی کڑوی کسیلی باتوں کے بعد اس کا نظارہ وہ میٹھی گولی تھا جسے میں نظروں کے ذریعے اپنی زبان پر رکھتا اور دھیرے سے نگل کر ہر غم سے آزاد ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی خالی سیٹ سے مجھے وحشت ہونے لگی۔

سوا نو بجے وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

"اوہ" مجھے اپنی جگہ دیکھ کر وہ وہیں رک گئیں۔

"حاضر ہو سکتی ہوں سر"

"آیئے پلیز!" میں مسکرایا۔ "آج آپ نے دیر کر دی۔"

"جی سر۔ وہ میری بس نکل گئی تھی۔" اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ "مزید یہ کہ لفٹ میں بھی کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ دس منٹ اس میں لگ گئے۔"

"اوہ آئی سی۔ لیکن آپ کی بس کیوں نکل گئی؟"

تیرا حسن تیرے حسن بیاں تک دیکھوں' کے شوق نے مجھ سے جرح کا سلسلہ جاری کروائے رکھا۔

"بس سر۔ وہ" وہ خجل سی کھڑی تھی۔

تب میں نے دیکھا۔ سفید آنچل کے اندر اس کے لانبے سیاہ بال اس کی کمر تک آ رہے تھے۔ اور ان کے سروں پر پانی کی ننھی بوندیں ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ نہا کر آئی تھی اور شاید اسی لئے لیٹ ہو گئی تھی۔ ورنہ تو وہ ان زہریلی ناگنوں کو ایک سخت چوٹی میں مقید رکھا کرتی تھی۔

"مس انصاری۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟" میں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے قدرے چونک کر میرے جانب دیکھا شاید لہجہ نرم ہونے کے ساتھ ساتھ رومینٹک بھی ہو گیا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ اور میں فائلوں پر جھک گیا۔

بادل بری طرح سے گھر آئے تھے۔ اور بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ہوا میں ٹھنڈک' خنکی' خوشبو' مستی سبھی کچھ در آیا تھا۔ یہ میرا پسندیدہ موسم تھا۔ اس موسم میں میرا جی چاہتا میں کچی مٹی پر لیٹ جاؤں اور اس کی ساری ٹھنڈک' ساری خوشبو اپنے اندر اتار لوں۔

ٹی شرٹ اور ہاف جینز پہن کر میں لان میں آ گیا۔ عنبرین اپنے کمرے کا دروازہ مقفل کیے سو رہی تھی۔ یہ اس کی بد مزاقی کی بڑی دلیل تھی۔ ایسے موسم میں وہ ہمیشہ کھڑکیاں بند کر کے' پردے گرا کے سو جاتی تھی۔ بقول اس کے اسے اس اندھیرے ماحول میں گھٹن ہوتی تھی۔

میں لان میں چہل قدمی کرتا رہا۔ کریم مجھے کافی کا مگ تھما گیا تھا۔ موسم کا لطف گرم گرم کافی دوبالا کر رہی تھی۔ کیاریوں میں جھومتے گلابوں سے اٹھکیلیاں کر کے ہوا جب مجھ سے ٹکراتی تو میں جلدی سے ساری خوشبو اپنے اندر اتار لیتا۔

چلتے چلتے میں مڑا تو دیکھا۔ عنبرین اٹھ کر باہر آ چکی تھی۔ سیاہ شال لپیٹے وہ لان کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ ایک تو مجھے سیاہ رنگ سے جتنی وحشت ہوتی تھی' وہ اتنا ہی اس رنگ کو اپنے ملبوسات میں جگہ دیتی۔ یہ رنگ اس کی بے رونقی میں مزید اضافہ کرتا تھا۔ شاید اس کو اندازہ نہ تھا۔

"وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ یہاں آ جاؤ"

میرا موڈ خوشگوار تھا۔ میں نے اسے پکار لیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مجھ تک آ گئی۔

"حیرت ہے۔ تم اتنی جلدی اٹھ گئیں۔ وہ بھی اس گھٹے ہوئے ماحول میں؟" میں نے اسے چھیڑا۔

تم تو چاہتے ہو گے کہ میں سوتی رہوں۔" اس کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا۔

اس کے اس طنزیہ لہجے سے میرے اندر تک آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

''کیوں بھئی۔ میں کیوں ایسا چاہوں گا؟'' لازمی امر تھا کہ میرا لہجہ بھی خشک ہو جاتا۔

''تاکہ میری غیر موجودگی میں جی بھر کر عیاشیاں کر سکو۔''

''کیسی عیاشیاں؟'' میں تنک کر اس کی جانب مڑا پھر میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ سامنے والے بنگلے کے ٹیرس پر دو لڑکیاں کھڑی موسم کو انجوائے کر رہی تھیں۔

''اوہ؟'' میں نے گہری سانس لی۔

''اب کہہ دو کہ تم نے تو انہیں ابھی ابھی دیکھا ہے؟'' وہ پھر طنزیہ مسکرائی۔

''نہیں۔'' میں قطعاً سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں تو انہیں پچھلے دو گھنٹوں سے تاڑ رہا ہوں۔''

اپنی بات کا کوئی تلخ سا جواب سنے بغیر گملوں کو ٹھوکر سے گراتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا میں اندر آ گیا۔ بڑی عجیب عورت تھی۔ اس نے زندگی میں محض ایک فن سیکھا تھا۔ خوشیوں کو پائمال کرنا اور کرتے رہنا۔ اس سے آگے اسے کچھ علم نہ تھا۔ پیار، محبت، اعتماد، اعتبار، رشتوں کا تقدس و احترام، وہ ہر شے سے عاری تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ بحیثیت ایک بیوی کے شوہر پر اندھا شک کرنا اس کا حق ہے۔

میں نے کمرے سے گاڑی کی چابی لی اور باہر آ کر کسی بھی جانب دیکھے بغیر گاڑی نکال کر سڑکوں پر لے آیا۔ گھر سے دور رہنا اس نے میری مجبوری بنا دی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں کس نقطے سے اپنی زندگی کی ابتداء کروں؟ اس ڈانواں ڈول ناؤ کو کیسے متوازن رکھوں۔ خوشیاں کس شئے سے کشید کروں۔ عمر کیسے بسر کروں؟''

گاڑی لے کر میں سڑکوں پر بلا مقصد اور بنا کسی جواز کے پھر رہا تھا۔ یکایک سائیڈ مرر میں ایک چہرا ابھرا اور دور ہوتا چلا گیا۔ میں نے بریک لگائی اور گاڑی ریورس کر کے لایا۔

وہ بلاشبہ ربیعہ تھی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور تھیں۔ چپس کے پیکٹ تھامے

ہنستی مسکراتی وہ غالباً موسم کا لطف اٹھانے گھر سے نکلی تھیں۔ دھانی کپڑوں میں، بلا تکلف قہقہہ لگاتی ربیعہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

''ربیعہ!'' میں خود کو اسے پکارنے سے نہ روک سکا۔ وہ چونک کر مڑی تھی۔

''سر آپ۔'' مجھے اچانک سامنے پا کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

پھر اپنی ساتھی لڑکیوں کو قدرے پیچھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ آئی۔

''جی سر!'' وہ ذرا سا جھکی۔ اسی شریر لٹ نے سر نکالا اور اس کے گال کے ساتھ ساتھ لہرانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہیں اس موسم میں؟'' میں مسکرایا ''کون ہیں آپ کے ساتھ؟''

میری فرینڈز ہیں سر۔'' وہ نجانے کیوں خجل سی تھی۔ ''ہم یونہی ذرا گھومنے نکلے تھے۔''

''اگر آپ کی فرینڈز سے کچھ دیر کے لئے آپ کو چرا لیا جائے تو؟''

اس نے نظریں چرا لیں۔

''چلیں۔ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔'' میں نے اس کا گریز بھانپ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''نہیں نہیں سر۔ ایسی بھی بات نہیں۔'' پھر اس نے مڑ کر انہیں آنے کا اشارہ کیا۔

''انہیں آپ ہاسٹل اتار دیں گے۔''

''ضرور'' میں نے مسکرا کر پیچھے کا لاک کھولا...... پھر جھک کر فرنٹ ڈور کھول دیا۔

وہ گھوم کر آئی اور دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

''آپ کی تعریف؟'' پیچھے سے چنچل آواز ابھری۔

''مجھے منہاج کہتے ہیں۔''

''میں انہی کے آفس میں تو کام کرتی ہوں۔''

ربیعہ نے مڑ کر وضاحت کی۔ ''سر! یہ دونوں میری بہت اچھی فرینڈز ہیں۔''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''یہ سیکا ہیں اور یہ عائشہ۔''

"خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔" میں نے رسماً کہا۔

ان دونوں کو ویمن ہاسٹل اتار کر میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"آپ ...... ہاسٹل میں رہتی ہیں؟" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی" اس نے مختصراً کہا۔

"کیوں؟"

"پھر کہاں رہوں سر؟" وہ مسکرائی۔

میں گڑبڑا سا گیا۔

"میرا مطلب ہے آپ کا گھر؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے سر۔" وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ایک والد ہی کا سہارہ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد قرض وغیرہ اتارنے کے لئے مجھے گھر بیچنا پڑا۔ کچھ عرصہ اسی رقم سے گزارا کرتی رہی۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ کرائے کے گھر بہت مہنگے ہیں اور رقم بہت قلیل۔ علی صاحب ہمارے پڑوسی ہیں۔ انہیں کی معرفت آپ کے آفس میں جاب بھی مل گئی اور ہاسٹل میں کمرا بھی۔" خدا انہیں خوش رکھے۔"

اگر علی شادی شدہ نہ ہوتا اور اپنی بیوی سے بے تحاشا محبت نہ کرتا تو شاید اس وقت میں حسد میں مبتلا ہو جاتا لیکن چونکہ میں صورت حال سے واقف تھا لہٰذا خوش دلی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔

"لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں سر؟" اسے دفعتاً خیال آیا تو وہ پریشان سی ہو گئی۔

"بے فکر رہیں۔ آج چھٹی ہے' آفس نہیں جا رہے۔"

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"میں کام سے گھبراتی تو نہیں ہوں سر۔ جو آپ طنز کر رہے ہیں۔"

"نہیں میں طنز نہیں کر رہا ہوں۔ طنز سے تو مجھے سخت نفرت ہے۔" میں بولا۔ "ہم ساحل سمندر پر جا رہے ہیں۔"

"کیوں سر؟"

"موسم انجوائے کرنے۔ کیا آپ ہاسٹل سے انجوائے کرنے نہیں نکلی تھیں۔" میں

نے خوش دلی سے دریافت کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

وہ دن بڑا خوبصورت دن تھا۔ ہم دونوں دیر تک سمندر کے کنارے ٹہلتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے۔ پھر میں نے اسے اچھا سا ڈنر کرایا اور رات کو آٹھ بجے ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے اتار دیا۔

مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنی خشک نہیں جتنی کہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ گھلتی ملتی بھی تھی اور ہنسی مسکراتی بھی تھی لیکن اپنی ذات کی حفاظت بڑے محتاط طریقے سے کیا کرتی تھی۔ اس پوری ملاقات کے دوران مجھے اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ وہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس سے محبت کی جا سکتی تھی۔

زندگی اچانک اس قدر خوش گوار ہو جائے گی' میں نے کبھی گمان تک نہ کیا تھا۔

عنبرین احمد نے مجھے ذہنی طور پر اتنا مایوس' اتنا کُند بنا دیا تھا کہ میری تمام تر لطیف حسیات مری گئی تھیں۔ اگر کبھی سر اٹھاتیں بھی تو وہ اپنی ترش روی کے ڈنڈے برسا برسا کر انہیں دوبارہ گہری نیند سلا دیتی۔

کہتے ہیں انسان جس چیز سے بے تحاشا خوفزدہ رہے' وہ ہو کر رہتی ہے۔ اسے محض یہی ایک خوف تھا کہ میری زندگی میں اس کے علاوہ کوئی دوسری عورت نہ آ جائے۔ میں ہینڈسم تھا' جوان تھا۔ اس سے شادی کر کے لکھ پتی بن چکا تھا۔ ایسے میں اس کا اندیشہ ایسا کچھ بے بنیاد بھی نہ تھا۔ لیکن میں سوچتا ہوں' اگر وہ اس بات کو اپنے لئے ایک روگ نہ بنا لیتی اور اپنی دانست میں مجھے راہ راست پر رکھنے کے یہ غلط اور بے ہودہ طریقے نہ اپناتی' تو شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔ میں تو بڑا قناعت پسند تھا۔ میں نے اسے بیوی کے روپ میں پہلے دن سے قبول کر لیا تھا۔ نہ اس سے پہلے کبھی میں نے کسی میں دلچسپی لی تھی اور نہ ہی بعد میں ایسا کچھ کرنے کا سوچا تھا۔ لیکن اس نے ذرا سے اندیشے کو اپنا روگ اور میری چڑ بنا ڈالا۔ اس نے اتنی احتیاط دکھائی' اتنی احتیاط دکھائی کہ بالآخر میں اس کے جور وستم سے گھبرا کر ربیعہ انصاری کی گھنی زلفوں کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ میں عنبرین کی جگہ کسی اور کو دوں' اور نہ ہی اب ایسا

کوئی ارادہ تھا۔ میں جانتا تھا ربیعہ انصاری سے میں کسی صورت شادی نہ کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں مجھے کس کس سے محروم ہونا پڑتا' مجھے پوری طرح سے علم تھا۔ میرے لئے تو بس وہ ایک شجر سایہ دار کی مانند تھی' جس کی چھاؤں میں ایک تھکے ہارے مسافر کی مانند چند گھڑی کے لئے رک گیا تھا۔ اس چھاؤں کو چھوڑ کر تپتے ہوئے ریگزار میں مجھے پھر آگے بڑھنا تھا مجھے اچھی طرح سے علم تھا۔

یہی وجہ تھی کہ زندگی کے ان لمحات سے میں خوشیوں کا آخری قطرہ بھی کشید کر لینا چاہتا تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

''مجھے تمہارے بال بہت پسند ہیں۔'' میں نے اس کے گال سے کھیلتی لٹ کو انگلی سے دھیرے سے چھوا۔ ''تم انہیں کھولتی کیوں نہیں ہو؟''

اس نے خاموشی سے لٹ پیچھے کر لی۔ میں جب بھی اسے چھو لیتا وہ برہم سی نظر آتی تھی۔

''بولو ناں۔ تم بال کھولتی کیوں نہیں ہو؟''

''بہت گھنے ہیں ناں۔ الجھ جاتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی اور سامنے پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھنے لگی۔

''اور ہم جو الجھ گئے ہیں تمہاری اس لٹ میں محترمہ ربیعہ انصاری۔'' میں دھیرے سے ہنسا۔ ''ہمیں تو آزاد کرو ناں۔''

اس نے شکایتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''میں نے آپ کو کب کہا کہ آپ میرے قیدی ہیں۔ آپ تو آزاد ہیں۔''

''صیاد اپنا قصور نہ بھی مانے' صیاد ہی رہتا ہے۔''

''آپ۔ آپ بہت عجیب آدمی ہیں منہاج''

''کیوں۔ میرے دو سینگ ہیں؟'' میں نے حیرانی سے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''آپ نے کس طرح سے یہ سارا کھیل شروع کیا۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔ نجانے کیسے یہ سب کچھ شروع ہو گیا۔ میں کیسے آپ سے ملنے لگی۔ ہمارے درمیان ایک عجیب سا رشتہ کیسے پیدا ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا منہاج۔''

''محبت کہتے ہیں اسے جان من۔'' میں ہنسا۔ ''اور یہ ایسے ہو جاتی ہے۔ بنا بتائے' بنا سمجھائے۔''

''مجھے ان فضول ناموں سے مت پکارا کریں۔'' وہ ناراض ہوئی۔

''کیوں؟ کیا ہرج ہے اس میں۔ زندگی ہی تو بن گئی ہو میری۔''

''تو پھر۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں خاموش ہو کر قدموں تک آتی لہر کو دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا' اس کے لبوں پر کس سوال نے آ کر دم توڑا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر میں اسے اتنا ہی چاہنے لگا ہوں تو پھر اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر وہ میری زندگی بن گئی ہے تو پھر دولت اب تک میری مجبوری کیوں بنی ہوئی ہے۔ میں عنبرین سے بیزار ہوں تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتا تاکہ وہ اپنی زندگی بسر کرے اور میں اپنی۔

اور چونکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان سارے سوالات کا واحد جواب خاموشی ہے۔ لہٰذا میں اس سے یہ پوچھے بغیر کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے' خاموش ہی رہا۔

کبھی کبھی مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اسے استعمال کر رہا ہوں۔ اپنی وقتی خوشیوں کے لئے اسے اس کی آئندہ آنے والی خوشیوں سے محروم کر رہا ہوں۔

میں نے اسے سکون آور دوائی سمجھ لیا تھا۔ شراب کا جام سمجھ کر قطرہ قطرہ پی رہا تھا۔ لیکن وہ سکون آور دوائی' یا شراب کا پیالہ نہ تھی۔ وہ ایک عورت تھی۔ زندگی کی تمام تر خواہشوں سے بھری ہوئی۔ تو میری جز وقتی خوشیوں اور ذرا سی تسکین کے لئے وہ اپنی ساری عمر کو داؤ پر لگا رہی تھی۔

لیکن میں کرتا بھی کیا۔ وہ میری اشد ضرورت بن گئی تھی۔ مجھے یوں لگتا کہ میں برسوں کا افیمی ہوں اور وہ میری افیم کی پڑیا ہے۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ یہ سب برا ہے میں اسے استعمال کرتے رہنے پر مجبور تھا۔ میں نے ایک طویل عرصے کے بعد خوشیوں کا مزا چکھا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس خیال سے ہی میرے اندر نہیں' نہیں' نہیں کی گردان شروع ہو جاتی تھی اور اس طاقتور آواز کو دبانا میرے بس سے باہر تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

''سر۔ یہ پیپرز ٹائپ ہو گئے ہیں۔''

اس نے چند کاغذات میری جانب بڑھائے۔

''میں آج ذرا جلدی جانا چاہتی ہوں۔''

میں نے فائل پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آج پھر اس نے آسمانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

''یہ رنگ کس کو اتنا پسند ہے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔ ''اکثر پہنتی ہو۔''

''جس کو پسند تھا اب وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔'' میں اس لئے پہنتی ہوں کہ مجھے خود کو بھی یہ رنگ پسند ہے۔''

میرا دھیان اس کے پہلے جملے میں اٹکا ہوا تھا۔

''جلدی کیوں جانا ہے؟'' پھر میں نے سر جھٹک کر پوچھا۔

''کچھ شاپنگ کرنی ہے۔''

''شاپنگ آفس ٹائم کے بعد نہیں ہو سکتی؟'' میرا لہجہ سنجیدہ تھا۔ مجھ سے میری محبت کا خراج یوں وصول کرتی ہو؟ چھٹیاں مانگ کر۔''

اس کا چہرہ یک دم تپ گیا۔ کانوں کی لوؤں تک سرخ انگارہ ہو گیا۔ پھر وہ بنا کچھ کہے اپنی سیٹ کی جانب مڑ گئی۔

''موم کی گڑیا۔'' میں نے سوچا۔ دراصل وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ میں اسے جانے کی اجازت دے ہی نہیں سکتا تھا۔

آفس کا ٹائم ختم ہوا تو وہ اٹھ کر اپنی چیزیں اپنے ہینڈ بیگ میں غصے سے ٹھونسنے لگی۔ میرا کام تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ میں تو بے فکری سے بیٹھا اسے کام کرتا دیکھ رہا تھا۔

جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔

میرے ساتھ ساتھ چلنا اس کی مجبوری بن گیا۔ لیکن باہر آ کر اس نے راستہ بدل لیا۔ میں لفٹ کی جانب بڑھا تو وہ سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لیکن میں نے اسے روکا نہیں۔

ہانپتی کانپتی جب وہ لال چہرا لئے آخری سیڑھی پر آئی تو میں ریلنگ سے ٹیک

لگائے اس کا منتظر تھا۔

''لہو کچھ سرد پڑا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ جواب دیئے بنا آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ باہر نکل کر میں پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے پتہ تھا اس کی مطلوبہ بس دس منٹ بعد آتی ہے۔

اطمینان سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا میں اس کے قریب لے آیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔ لازمی امر تھا کہ وہ اتنے لوگوں کے سامنے تماشا بننا نہیں چاہتی تھی سوائے بیٹھنا پڑا۔

''کہاں چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جہنم میں۔'' وہ تڑخ کر بولی۔

''نہیں بھئی۔'' میں نے ڈرنے کی اداکاری کی۔ ''اب ایسے بھی حالات نہیں۔''

''منہاج صاحب!'' اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ ''گاڑی روکیں۔''

''نہ روکوں تو؟''

تو میں دروازہ کھول کر کود جاؤں گی۔'' وہ جھلائی۔

سوچ لو۔ تمہیں چوٹیں آئیں گی' شاید ہاسپٹل لے جانا پڑے۔ بات پھیلے گی۔ لوگوں کو پتا چلے گا کہ ہم دونوں ساتھ تھے اور ہماری ہاتھا پائی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کی بدنامی ہو گی۔ تمہیں اس کا ڈر نہیں ہے؟''

''میں آپ کی طرح ڈرپوک نہیں ہوں۔'' وہ آنکھوں میں اترتی نمی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ''بزدل۔'' میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

''نجانے میں کیوں ملتی ہوں آپ سے۔ نجانے مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔

''نہیں۔'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔''

''پھر کس سے کرتی ہو؟'' میں نے سکون سے پوچھا۔ ''اس جسے آسمانی رنگ پسند ہے؟''

''ہاں۔ منگیتر ہے وہ میرا۔''

''میرے اندر کئی پھنا کے ہوئے۔'' لیکن میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ میرا اس پر کوئی حق نہ تھا۔ وہ کسی کو بھی چاہنے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ میں اس سے بازپرس کا مجاز نہ تھا۔ وہ کسی بھی لمحے مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ میں اسے پکارنے کا جواز نہ رکھتا تھا۔ میرے

دماغ میں ان سب سوچوں نے دھواں سا بھر دیا۔

"میرے منگیتر کا نام فصیح ہے۔" وہ میری اداسی کو محسوس کر کے دھیرے سے بولی۔

"ہوگا۔" میں خشک لہجے میں بولا۔

"امی کے انتقال سے دو تین سال قبل ہماری منگنی ہوئی تھی۔" وہ شاید مجھے سب کچھ بتانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ "وہ میری پھوپھی کا بیٹا تھا۔ اور ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ پھر اس پر کچھ بننے کی دھن سوار ہو گئی۔ اور وہ ہمیں چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ کچھ عرصہ اس کے خطوط آتے رہے پھر علم ہوا کہ گرین کارڈ حاصل کرنے کے لئے اس نے وہاں کسی عورت سے شادی کر لی ہے۔"

"اور آپ اب تک اسے اپنا منگیتر سمجھتی اور پکارتی ہیں۔" میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

"آپ کو تو طنز سے سخت نفرت ہے ناں۔" وہ دکھی انداز میں بولی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔

"جینے کے لئے بہانوں کی ضرورت ہوتی ہے منہاج صاحب۔" پھر وہ بولی۔ "اور بہانے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کھوکھلے اور بے جان۔ لیکن ان کے دم سے زندگی تو چلتی رہتی ہے ناں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو زبیدہ۔"

اس نے وہ سب کہا تھا جو خود میرے دل میں تھا۔ ہم دونوں دو علیحدہ علیحدہ راستوں کے راہی تھے۔ جو اکیلے پن کے خوف سے ساتھ ہو لئے تھے۔ بالآخر کسی مقام پر ہمیں بچھڑنا تھا۔ ہم دونوں ہی جانتے تھے۔

"کیا خرید وگی؟"

مارکیٹ کا رخ کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"تھوڑی سی خوشیاں' ذرا سی بے فکری۔ چند مسکراہٹیں۔"

"میں نے اس کی سمت دیکھا اور مسکرا دیا۔ اور دکان والے کو کیا دو گی؟"

"یہی سب کچھ۔"

ہم دونوں ہی ہنس دیئے۔

میں دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوا تو ایک لمحے کے لئے چکرا سا گیا۔ چھت پر' دیواروں پر' قالین پر' ہر جانب پھول ہی پھول تھے۔ تازہ گلابوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا۔

"کیا میں کسی اور گھر میں آ گیا ہوں۔"

چند ثانیوں کے لئے میں واقعی گھبرا گیا لیکن پھر فرنیچر اور دیگر چیزوں نے احساس دلایا کہ گھر اپنا ہی ہے۔ تعجب سے یہ سب کچھ دیکھتا ہوا میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ گلابوں نے یہاں بھی ڈیرا جمایا ہوا تھا۔

اسی وقت باتھ روم کا دروازہ کھلا اور عنبرین گنگناتی ہوئی باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ (مجھے آنکھوں پر یقین آ گیا۔)

"آج بڑی دیر کر دی۔" وہ گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہی تھی۔

میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ دیگر دنوں کی نسبت آج میں کچھ جلدی آ گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ یہ ایک جگہ منجمد کیوں ہو گئے؟" وہ آئینے میں میرا عکس دیکھ کر مسکرائی۔

"آنکھوں پر یقین آتا ہے نہ کانوں پر۔" میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے سانس بھری۔ "نہ یہ کمرہ مانوس نظر آتا ہے نہ تمہاری گفتگو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا جلدی سے چینج کریں میں کھانا لگاتی ہوں جانتے ہیں آج میں نے آپ کے لئے چائنیز کھانا بنایا ہے۔"

وہ مجھ سے گفتگو کے لئے "آپ" کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ حیرت سے میری آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

''یا خدا۔ یہ آج سورج کہاں سے نکلا تھا۔ میں نے صبح غور کیوں نہیں کیا؟''

سوچتا ہوا میں باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر باہر نکلا تو وہ کھانا لگا چکی تھی۔

ہر چند کہ میں ربیعہ کے ساتھ کھانا کھا کر آیا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر کھانے بیٹھ گیا کہ انکار کا تو آج کوئی سوال ہی نہ تھا۔

کھانے کے بعد وہ مجھے کمرے میں چلنے کا کہہ کر کافی بنانے چلی گئی۔ اس نے سارے نوکروں کو چھٹی دی ہوئی تھی اور گھر میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

میں کمرے میں آ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے اس نئی تبدیلی کے بارے میں سوچنے لگا۔ جو قطعاً غیر متوقع تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے قدموں میں بیٹھی تھی۔ سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ جو میرے ہاتھ کی پشت پر گر رہے تھے۔

''عنبرین۔ کیا ہوا ہے؟'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''یار۔ کچھ بتاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''پاگل تو میں ہو گئی تھی منہاج۔ اپنے ہاتھوں اپنا گھر اجاڑنے چلی تھی۔'' وہ سسکی۔ ''مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔ پانچ سال سے آپ کی زندگی عذاب کر رکھی ہے میں نے۔ نہ صرف آپ کی بلکہ ہم دونوں کی۔ مجھے میرے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو گیا ہے۔ منہاج مجھے معاف کر دیں۔''

''جب تمہیں احساس ہو ہی گیا ہے۔ تو معافی کا کیا سوال؟'' میں مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔

''دیکھو عنبرین! اب اس روش کو پھر کبھی مت اپنانا جس نے ہماری اچھی بھلی زندگی کے پانچ بہترین سال ہم سے چھین لیے۔''

''میرا اتنا قصور ہے منہاج۔ کہ میں آپ سے انتہائی شدت سے محبت کرتی ہوں۔ اور مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ آپ کبھی مجھے چھوڑ کر کسی اور کو نہ اپنا لیں۔''

''اور ان بے بنیاد اندیشوں پر تم بے اعتباری کی عمارت کھڑی کرتی چلی گئی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں' میں آئندہ آپ پر کبھی شک نہیں کروں گی۔''

''میں بھی وعدہ کرتا ہوں عنبرین۔ جو تمہاری جگہ ہے' وہ صرف تمہاری رہے گی۔''

''پھر۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔

''ہاں کہو۔''

''پھر ربیعہ انصاری کو فوراً سے پیشتر اپنے دفتر سے نکال باہر کریں۔''

میں ششدر رہ گیا' لیکن صرف چند ثانیوں کے لئے۔ پھر میں واپس اپنی سابقہ حالت میں لوٹ آیا۔ ربیعہ انصاری اور میرا تعلق اب کوئی راز نہ رہا تھا۔ دفتر میں۔ دفتر سے باہر بہت سے لوگ تھے جو ہمیں کئی مقامات پر ساتھ دیکھ چکے تھے۔ ایسے میں عنبرین جیسی جاسوس فطرت عورت سے یہ بات چھپی رہنا ممکن بھی نہ تھا۔

''ربیعہ انصاری! وہ محض ایک سایہ ہے عنبرین۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں۔''

''میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔'' اس نے ناک سکوڑی۔ ''لیکن یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے منہاج۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس مسئلے کو فی الوقت موضوع بحث نہ بناؤ۔ یہ وقت تو اچھی اچھی باتیں کرنے کا ہے۔''

نجانے وہ کس دل سے مسکرائی تھی۔

جس طوفان کے اٹھنے سے میں دل ہی دل میں انتہائی خوفزدہ تھا' وہ آ کر اس خاموشی سے گزر جائے گا۔ میرے تصور میں بھی نہ تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہ ہوائی قلعے بنا کر جنگ لڑا کرتی تھی۔ جب حقیقی قلعہ دیکھے گی تو اس کا کیا حال ہو گا۔ لیکن ہوا یوں کہ اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ یہ میرے لئے زندگی کی حقیقی خوشیوں کی نوید تھی۔

''کل آپ کی سالگرہ ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے؟'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

''اچھا!'' میں نے تعجب سے سوچا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج میری سالگرہ ہے۔ یہ اتفاق' یہ التفات۔''

وہ ہنس دی۔

"سچ بتاؤں منہاج! میں ماہر نفسیات سے ملی تھی۔"

"ہائیں وہ کیوں؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں جاننا چاہتی تھی کہ میری زندگی اس قدر بے کیف کیوں ہے۔ میرے پاس محبت کیوں نہیں ہے' خلوص' اعتبار' اعتماد سے میرا دامن کیوں اتنا خالی ہے۔ ایک ہفتے کے علاج سے ہی مجھ پر یہ بات روشن ہو گئی کہ سارا قصور میرا اپنا ہے۔ تمہیں کھو دینے کے خوف کی انتہا پر جا کر میں خود بخود تمہیں کھو بیٹھی تھی۔ تم دوسروں کے ہو رہے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی سارے کام خود بخود بنتے چلے گئے۔ اور دیکھو لو آج ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے ہیں۔"

"اور تم وعدہ کر چکی ہو کہ اب دور نہیں جاؤں گی۔"

"وعدہ تو تم نے بھی کیا ہے ایک مجھ سے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ مبادا وہ ان میں ربیعہ انصاری کا عکس نہ پا لے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ نگاہیں تو تب جھکتی ہیں جب دل میں چور ہو۔

"چور تو تم ہو ربیعہ۔ کتنی صفائی سے میرے دل پہ ہاتھ صاف کر گئی ہو کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ ہو کر بھی تمہیں سوچتا ہوں۔"

"کیا سوچنے لگے؟"

"آں۔" میں چونکا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ کل میری سالگرہ ہے اور تحفہ تم نے مجھے آج دیا ہے۔ سچی خوشیوں کا تحفہ۔"

"ٹھیک ہے۔" میں بھی مسکرا دیا۔

"کل تم آفس سے بھی چھٹی کر لو۔"

"ٹھیک۔" مجھے حامی بھرنی پڑی۔

وہ خوش تھی اور مجھے اس کی خوشی کا پاس کرنا تھا کہ بہر حال وہ میری پہلی اور آخری بیوی تھی۔ اور یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے کر چکا تھا۔

* * *

دوسرا دن مصروف گزرا۔ عنبرین نے مجھے پورا دن مصروف رکھا۔ صبح وہ مجھے

شاپنگ پر لے گئی۔ اور مجھے ڈھیروں ڈھیر چیزیں دلائیں۔ لنچ ہم نے ہوٹل میں کیا۔ پھر ہم گھومنے ساحل سمندر پر گئے جہاں سے رات گئے کھانا کھا کر لوٹے۔

شاید وہ شعوری طور پر مجھے ذہنی طور پر خود سے قریب کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ پانچ سال کی کسر ایک ساتھ نکال لینا چاہتی تھی۔ جس سے میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔

رات کو تھک ہار کر جب میں بستر پر لیٹا تو میرا ذہن جسم کی تھکاوٹ سے قطع نظر بالکل چوکس تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں خود کو جاننا چاہ رہا تھا۔ میری اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں میں ربیعہ کو چاہتا تھا۔ یہ ایک قطعی بات تھی جس میں شک و شبہ کی تو کوئی بات ہی نہ تھی لیکن میں اسے اپنا نہیں سکتا تھا یہ بات تو طے تھی۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا وہ سب عنبرین کا تھا۔ عنبرین کو چھوڑ میں عرش سے فرش تک کا فاصلہ محض ایک قلابازی میں طے کرتا جو مجھے منظور نہ تھا۔ غم جاناں قابل برداشت تھا۔ غم دوراں ناقابل برداشت ہوتا اور پھر عنبرین کو چھوڑ کر میں ربیعہ کو اپنا بھی لیتا تو شاید ہمارے بیچ ایسے ہی جھگڑے ہوا کرتے۔ مجھے جب جب یہ آسائشات یاد آتیں میں غیر شعوری طور پر اسے معتوب ٹھہراتا۔

یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے' جانتے ہوئے' ہونا یہ چاہیے تھا کہ میں ربیعہ سے کنارہ کش ہو جاتا۔ لیکن کم بخت دل اس پر بھی راضی نہ ہوتا تھا۔

بہر حال' ہونا یہی تھا۔ آج یا کل۔ مجھے ربیعہ سے علیحدہ ہونا تھا۔ اسی میں میری بہتری تھی۔ میرے بہتر مستقبل کی ضمانت تھی۔

"آئی ایم سوری ربیعہ۔" میں نے سونے سے قبل اس کے تصور کو مخاطب کیا۔

"یقین کرو اسی میں ہماری بھلائی ہے۔"

* * *

دوسرے دن وہ کچھ خاموش سی تھی۔ اس کی ٹائپ رائٹر پر تھرکتی انگلیاں بار بار رکتیں۔ وہ کچھ سوچتی اور پھر ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی۔

"کہاں گم ہو؟"

وہ مجھے پیپرز پکڑانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"سر پلیز! مجھے ابھی بہت کام ہے۔"

"کیا بات ہے ربیعہ؟"

"کوئی بات نہیں۔"

"اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں ہو؟"

وہ خاموش کھڑی رہی۔

"منہاج صاحب۔" پھر وہ بولی۔ "میں یہ نوکری چھوڑ رہی ہوں۔"

میرے حواس پر ایک بم گرا۔

"کیوں؟"

"میں اب آپ کے ہاتھوں مزید کھلونا بننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"کھلونا۔ کیسا کھلونا؟" میں پریشان ہو گیا۔ "کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔"

"آپ۔ آپ مجھے شاید ایک گڑیا سمجھتے ہیں۔ جس سے جب جی چاہا کھیل لیا۔ جب جی چاہا اٹھا کر کونے میں ڈال دیا اور شوکیس سے دوسری گڑیا نکال لی۔"

"ہاں گڑیا تو میں تمہیں سمجھتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے اس کا رخ اپنا جانب موڑا۔ "اس لئے کہ تم لگتی بالکل گڑیا جیسی ہو۔ کبھی کانچ کی، کبھی موم کی۔ اور اس وقت بالکل پتھر کی گڑیا لگ رہی ہو۔ لیکن یہ کھیلنے اور ایک طرف رکھ دینے والی بات کیا ہے؟ اور یہ دوسری گڑیا کون ہے؟"

"آپ کی بیگم محترمہ عنبرین احمد۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "میں نے آپ دونوں کوک وہیں سیر کرتے دیکھا تھا جہاں آپ مجھے لے جاتے ہیں۔ اور آپ بے حد خوش نظر آتے تھے! آپ تو کہتے ہیں کہ آپ دونوں صرف نام کے میاں بیوی ہیں۔ آپ دونوں کے درمیان محبت، خلوص اور یقین کا کوئی رشتہ نہیں پھر وہ سب کیا تھا؟ لو برڈز کی طرح سر ملائے کون سے وعدے وعید ہو رہے تھے؟"

"اوہ!" میں گہری سانس بھر کر کرسی پر گر گیا۔

"میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" وہ آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو حلق میں اتارتے ہوئے بولی۔ "میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہوں۔"

مجھے یوں لگا اس نے مجھے ایک گہری پاتال میں دھکیل دیا ہو۔ نہیں، نہیں، نہیں کی گردان ایک بار پھر اسی شدت سے شروع ہو گئی۔ نجانے کیا بات تھی۔ جب میں خود ایسا سوچتا، اس آواز میں اتنی شدت نہ ہوتی اور جب وہ یہ بات کرتی میں بے حال ہو جاتا۔

"ربیعہ۔ ربیعہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔" میں بے بسی سے بولا۔

"منہاج صاحب! میں طوائف نہیں ہوں۔"

پھر وہ اپنا بیگ اٹھا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں پتھر کے بت کی مانند بیٹھا رہ گیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ نہ میں اسے اپناتا تھا، نہ چھوڑتا تھا۔ اور وہ اتنی خوددار تھی کہ اس نے مجھ سے آج تک اپنے منہ سے شادی کے لئے نہ کہا تھا۔

اس کی آنکھیں، اس کی ناک کی بناوٹ، اس کے لبوں کا کٹاؤ۔ میں نے تو پہلے دن ہی سارے اندازے درست لگائے تھے پھر میں غلطی پر غلطی کیوں کرتا رہا۔

میں تھکے ہارے انداز میں اٹھا اور اپنا کوٹ اٹھا کر آفس سے نکل گیا۔

"تم نے ربیعہ سے شادی کر لی ہے؟"

یہ پہلا سوال تھا۔ جو گھر میں گھستے ہی مجھ سے کیا گیا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"کون بکتا ہے؟"

"لوگ بکتے ہیں۔" وہ چلائی۔ "آخر تم اسے دفتر سے نکالتے کیوں نہیں؟"

"دفتری معاملات میں مداخلت تمہارا کام نہیں ہے۔" میں چلایا۔ "میں خود بہتر جانتا ہوں مجھے کس کو رکھنا ہے۔ کس کو نکالنا ہے۔"

"منہاج! میں نے پیار محبت سے تمہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن میں جان چکی ہوں کہ تم سدھرنے والی چیز نہیں ہو۔ آج تم دفتر گئے تو میں خوش تھی کہ واپسی پر تم مجھے اسے نکالنے کی خوشخبری دو گے لیکن پیچھے سے وہ منحوس مسز عثمانی فون کر کے بتا رہی ہیں کہ تم نے اس چڑیل سے شادی کر لی ہے۔"

"گلا گھونٹ دوں گا میں ان کا بھی تمہارا بھی۔"

حالانکہ میں ذہنی طور پر خود کو ربیعہ سے الگ کرنے پر تیار کر چکا تھا لیکن اس از سرنو

بحث نے مجھے الجھا دیا۔ مجھے خود پر قابو نہ رہا۔

''تم۔تم کیا میرا گلا گھونٹو گے۔ کیا ہو تم جس پر اتراتے ہو۔ میں ہر چیز چھین سکتی ہوں تم سے۔تم جانتے ہو۔''

''کیا چھین سکتی ہو تم؟ میری زندگی' میری خوشیاں؟ میری نیندیں؟ نہیں عنبرین احمد! تم کچھ نہیں چھین سکتیں یہ میری مروت تھی جو میں آج تک خاموش رہا لیکن اب! میں خود چھوڑ دوں گا تمہیں۔ تمہاری دی ہوئی ہر شے کو ایک ٹھوکر مار کر واپس تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ اور یقین کرو۔ ربیعہ انصاری کے ساتھ میری زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہ گئی اور میں کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں گھس گیا۔

❁ .... ❁ .... ❁

''زندگی تمہاری مرہون منت ان آسائشات کے بغیر بھی گزر سکتی ہے عنبرین احمد۔'' میں تیار ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ''ملتا ہی کیا ہے سوٹڈ بوٹڈ ہو کر ایک ویل فرنشڈ آفس میں بیٹھنے سے۔ انسان دو روٹی کھا کر چین اور سکون کی نیند سوئے' یہ کہیں بہتر ہے۔ اس سے کہ ایک لاکھ کے پلنگ پر پوری رات جاگ کر گزار دی جائے۔''

کمرے سے باہر نکل کر میں نے اس کے کمرے کے بند دروازے پر نگاہ ڈالی۔

''گڈ بائے''

میں باہر نکل آیا۔ٹیکسی کر کے میں سیدھا ربیعہ انصاری کے ہاسٹل پہنچا تھا۔

''مس ربیعہ انصاری۔'' آفس میں بیٹھی عورت نے مجھے دیکھا۔ آپ انہیں سے ملنا چاہتے ہیں ناں۔''

''جی جی۔'' میں نے بھی نام لیا ہے۔'' نجانے کیوں میرا اندر بہت بے چین تھا۔

''آپ بڑے وقت پر آئے ہیں۔ وہ تو بس کمرا خالی کر کے جانے ہی والی تھیں۔ اپنا سامان تیار کر رہی ہیں وہ۔''

''اوہ! میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔''

نجانے وہ کہاں چلی جاتی اور پھر کبھی مجھے ملتی بھی یا نہیں۔ میں عین وقت پر پہنچا تھا۔

ربیعہ اندر داخل ہوئی تو وہ عورت رسماً مسکرا کر باہر چلی گئی۔

''آپ!'' مجھے دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔'' اس وقت۔''

''ربیعہ۔چلو شادی کر لیں۔''

''مگر کیوں؟'' وہ یک لمحے کے لئے گھبرا سی گئی۔

''جو کچھ ہو رہا ہے' وہ میری قوت برداشت سے باہر ہے۔ اس لئے۔''

''جو کچھ ہو چکا ہے' اس کا علم غالباً آپ کو نہیں ہے۔'' اس کا چہرا نجانے کیوں سرخ ہو گیا۔

''کیا ہو چکا ہے؟'' میں نے حیرانی سے اس کی صورت دیکھی۔

''فصیح واپس آ گیا ہے اور آج ہم دونوں شادی کر رہے ہیں۔''

میں ساکت رہ گیا۔ چند لمحوں کے لئے دماغ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ الفاظ اور معانی سب آپس میں گڈ مڈ ہو گئے۔

''کیا۔ کیا کہا؟''

''مجھے یقین تھا۔ ایک روز وہ ضرور لوٹے گا۔'' وہ میز پر انگلی سے لکیریں کھینچنے لگی۔

'''اور وہ لوٹ آیا ہے۔ صرف میرے لئے۔''

''تمہیں یقین تھا کہ وہ لوٹے گا۔'' میں حیرانی سے اس کا چہرا تک رہا تھا۔'' تمہیں یقین تھا ربیعہ اور۔ اور تم مجھ سے۔ میرے جذبات سے کھیلتی رہیں؟ اس کی محبت کی صداقت پر اس قدر ایمان تھا تو میرے راستے کیوں کھوٹے کئے؟ جب تمہیں یقین تھا کہ تم میرے لئے نہیں ہو۔ تو کیوں آئی تھیں میرے اتنے قریب؟ کیوں چھائیں میرے حواس پر؟''

''ربیعہ بی بی۔'' چوکیدار نے آ کر دروازہ بجایا۔'' باہر آپ کی گاڑی آ گئی ہے۔ صاحب بلاتے ہیں آپ کو۔''

''منہاج صاحب۔'' وہ اپنا بیگ اٹھا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔'' میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتی ہوں لیکن سچ اگر الفاظ میں بیان نہ کیا جائے' تب بھی سچ ہی رہتا ہے۔ آپ غور کیجئے گا۔ ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔''

پھر وہ مڑی اور باہر نکل گئی۔ میں ہونقوں کی طرح ہاسٹل کے آفس میں تنہا کھڑا رہ گیا۔

"ہاں ربیعہ۔" پھر میں نے سوچا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ غور کرو تو ہر سوال کا بڑا واضح، بڑا تلخ، جواب نکلتا ہے۔ مجھے شکایت ہے کہ تم نے مجھ سے 'میرے جذبات سے کھیلا' یہ شکایت تم مجھ سے بہت پہلے کر چکی ہو۔ مجھے شکایت ہے کہ جب تمہاری منزل کچھ اور تھی تو تم میرے ساتھ کیوں چل رہی تھیں، یہ الزام تم بھی مجھ پر عائد کر سکتی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے شجر سایہ دار تھے۔ جن کے پاس کچھ دیر ٹھہر کر ستایا جاتا ہے۔ ان کے نیچے بسیرا نہیں کیا جاتا۔ بات بس اتنی سی ہے ربیعہ کہ ساتھ ساتھ چلنے میں تمہاری منزل پہلے آگئی اور تم نے مجھے خدا حافظ کہہ دیا۔ میری منزل قریب تھی تو میں نے بھی یہی کہنے کا سوچا تھا۔"

میں نے کھڑکی کے قریب آکر باہر جھانکا۔ کوٹ پینٹ میں ملبوس ایک جوان اس کے ہاتھ سے اس کا بیگ لے رہا تھا۔ ربیعہ انصاری کسی روبوٹ کی طرح اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

"اور منہاج احمد! تمہاری منزل اگر پہلے آجاتی تو۔"

میں نے ایک گہری سانس بھری اور میرے ذہن نے ابھی ابھی دیکھے گئے منظر کے لئے عنوان تجویز کیا۔

"تو۔ تم بھی تو یہی کرتے۔"

پھر میں مڑا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔